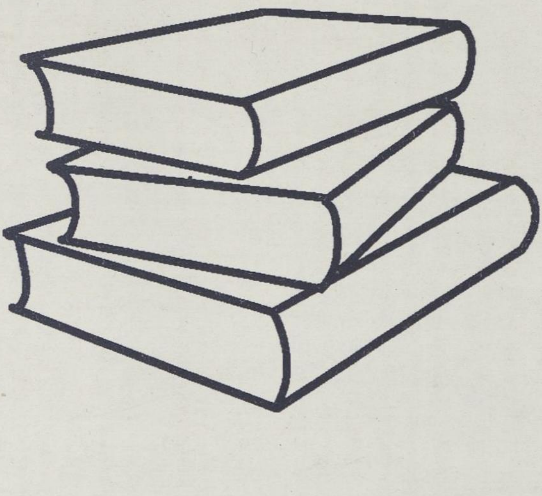
رازِ زندگی



امین گنجاہی

کمران کے لئے بہت پیار،
کے ساتھ فقط دعا گو
امین بخاری
9-07-2023

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رازِ زندگی

امین کنجاہی

نام کتاب	راز زندگی
مصنف	امین کنجاہی
اصل نام	محمد آصف امین منہاس
مدیر / پبلشر	طیبہ بخاری
خصوصی معاون	سید صداقت علی شاہ
نظر ثانی	عبدالمتین
تاریخ اشاعت	ستمبر 2021
ناشر	مکتبہ پاک ادب
طابع	طیب اقبال پرنٹر
ڈسٹری بیوٹر	سانجھ پبلیکیشنز
کمپوزنگ	عبدالمتین
قیمت (پاکستان)	300
قیمت بیرون ملک	2 ڈالر
تکنیکی معاونت	ساؤتھ ایشیاء میڈیا سروس (SMS)
	این ایس ٹیکنالوجیز پرائیویٹ لیمیٹڈ، فن کدہ
قانونی مشیر	حماد انصاری ایڈووکیٹ

کتاب منگوانے کا پتہ: 76 E لاہور پریس کلب ہاؤسنگ سکیم ہربنس پورہ لاہور

فون: 0308-4277410 = 0321-4270363

مکتبہ پاک ادب

ایم 42 آئی ٹی ٹاور 73 ای ون حالی روڈ گلبرگ تھری، لاہور

انتساب

میرے

والدین

کے نام

فہرست

اپنی تلاش میں

زندگی کا بہت سا حصہ پانی اور ریت کی طرح سے بہہ اور ہاتھ سے نکل گیا ہے، مگر دل ہے کہ مانتا نہیں، دل کہتا ہے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے، مگر عقل کہتی ہے، کہ بس بھائی بس۔ بقول غالب

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے

رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے

زندگی میں بہت سے نشیب و فراز آئے مگر ہار نہیں مانی، کبھی جسمانی معذوری آڑے آئی، کبھی تعلیم مکمل نہ ہو پائی، کبھی جو عشق کیئے نا مکمل ہوئے کیونکہ ہم کمپنی کا وہ مال تھے جو کہ کٹ پرائس شاپ پر رکھا جاتا ہے، مگر پھر بھی ہار نہیں مانی۔ آہستہ آہستہ دھیمے دھیرے دھیرے، لمحہ لمحہ چلتے رہے، زندہ رہنے کی آس میں خواہش میں۔ زندگی بھی رب نے کیا عجب بنائی ہے بھلے کوئی کتنا ہی لاغر و مجبور کیوں نہ ہو وہ دُنیا کو چھوڑنا نہیں چاہتا، دُنیا کی رنگینیوں اور دُنیا کی آسائشوں کی خواہشوں میں وہ ایک لمبا عرصہ تک زندہ رہنا چاہتا ہے۔ گو کہ یہ ناممکن ہے کیونکہ ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔

آج جب میں اپنی زندگی کی پانچویں کتاب کے بارے میں لکھنے بیٹھا ہوں اور آپ سے اپنے دل کی باتیں شیئر کر رہا ہوں، میری کیفیت کچھ ایسی ہی ہے کیونکہ دل تو بچہ ہے جی، تھوڑا کچا ہے جی۔ اِس بچے اور کچے کو پکا کرنے کیلئے میں نے اپنی زندگی میں بہت سے بزرگوں بابوں، مزاروں، بازاروں کی خاک چھانی ہے تب جا کر ہلکا سا "رازِ زندگی" کے بارے میں کچھ جان سکا ہوں۔ "رازِ زندگی" کو جاننے کا راستہ بہت تکلیف دہ اور کٹھن ہے بالکل ایسے ہی جیسے کہ کسی نے لگر پر انگور چڑھا دیا ہو، کسی نے لوہار کی دُکان پر بٹھا دیا ہو، کسی نے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کو چرانے پر لگا دیا ہو، کسی نے سردیوں کی سرد اور سیاہ راتوں میں اپنے محبوب کے در کے باہر آنکھوں کا کاسہ لے کر بٹھا دیا ہو کہ شاید کوئی خیر پڑ جائے، صحرا میں ننگے پاؤں چلنے پر مجبور کر دیا ہو، نا سر پر سایہ ہو نہ پاؤں میں جوتے ہوں۔ یا پھر کسی نے اُٹھا کر ہجر کے بے کراں سمندر میں پھینک دیا ہو کہ جا تو اپنے محبوب کا وصل حاصل کر لے مگر ایسا ہونا ناممکنات میں سے ہے۔

میرے جیسا ٹوٹا پھوٹا انسان نہ جس کے پاس علم ہے نہ عمل اگر کچھ ہے تو صرف حروف کی سیاہی ہے اور زندگی کا خالی صفحہ ہے جس پر زندگی کو تحریر کرنے کی کوشش میں نصف صدی سے لگا ہوا ہوں مگر ابھی تک ایک نکتے سے باہر نہیں نکل سکا نہ میں بابا بلھے شاہؒ، نہ میں وارث شاہؒ، نہ میں شاہ حسینؒ، نہ میں بھگت کبیر، نہ میں مادھو لال حسینؒ نہ میں سچل سرمستؒ، نہ لعل شہباز قلندرؒ، نہ میں میاں محمد بخشؒ، نہ میں بابا رحمٰنؒ نہ میرے اندر بابا فریدؒ، نہ سلطان باہوؒ، نہ میں مہر علیؒ۔ جس دور میں میں نے آنکھ کھولی میرے اِردگرد جو لوگ زندہ تھے اور جو لوگ کتابوں میں محفوظ تھے میں نے اُن سے زندگی کا اُوڑھنا بچھونا سیکھا جن میں قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی، واصف علی واصف، اشفاق احمد، بانو قدسیہ اور سرفراز شاہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی صحبت میں مجھے بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا اور جن سے میں نے اپنی روح کے اندر کی کمینگی ختم کرنے کی کوشش کی اور جن کی تعلیمات کی روح سے اپنے اندر کی روح سے گدھ جاتی اور کمینگی ختم کرنے کی کوشش کی۔ مجھے پتا نہیں کہ میں اس کام میں کس حد تک کامیاب ہوا مگر آج جو کتاب آپ لوگوں کے ہاتھوں میں دے رہا ہوں جس کا نام ''رازِ زندگی'' رکھا ہے یہ میری زندگی کی حکمت کو آپ تک پہنچانے کا شاید ذریعہ بن سکے۔

اِس کتاب کو پڑھنے کے بعد شاید آپ لوگ بھی دُنیاداری کے گورکھ دھندوں کو سمجھ سکیں اور اپنے وجود کو میرے اِن آسان لفظوں کے ذریعے، اپنی روح کی صفائی کرنے کا کام شروع کر دیں، اپنے اندر سے شر کو کم سے کم کرنے کی کوشش کریں، خیر کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی سعی کریں تاکہ ہمارا معاشرہ جس کے اندر بہت زیادہ بے راہ روی، گمراہی اور شر پھیل چکا ہے اُسے ہم اپنی اپنی حیثیت میں رہتے ہوئے اپنے اچھے اعمال سے کم کرنے کی کوشش کریں۔

یہ وہ چند باتیں تھیں جو میں آپ کے ساتھ شیئر کرنا چاہتا ہوں کہ آپ لوگ اس کتاب کو کم از کم ایک دفعہ ضرور پڑھیں، میں یہ سمجھوں گا کہ رب نے جو مجھے زندگی عطا فرمائی اور اِس زندگی کے نشیب و فراز سے گزر کر جو کچھ بھی میں نے مثبت تعلیم حاصل کی، میری یہ خواہش تھی کہ میرے یہ مضامین جو کہ ''رازِ زندگی'' کے نام سے قومی اخبارات میں شائع ہوتے رہے ہیں اور اِن مضامین کی ریکارڈنگ FM-102.2 رفع یونیورسٹی اسلام آباد کی ریڈیو لائبریری میں بھی موجود ہے، میں

نے سوچا کہ کیوں نہ اِن مضامین کی رسائی عام قاری تک بھی ہو۔ یہ مضامین اصل میں میری روح کا نچوڑ ہیں جو میں نے دُنیا اور باطن سے حاصل کیے ہیں اِس لئے میں چاہتا تھا کہ میری بات عام لوگوں تک پہنچے اسی کاوش کا ایک ذریعہ ''رازِ زندگی'' ہے، جس کا نام میں نے بہت سوچ سمجھ کر رکھا ہے کیونکہ ہر انسان اپنی زندگی کا راز پانا چاہتا ہے مگر وہ راز ہر کسی کے نصیب اور مقدر میں نہیں ہوتا۔
یہ میرے رب کا مجھ پر بہت بڑا اکرم اور احسان ہے کہ مجھے یہ توفیق عطا فرمائی کہ میں اپنی زندگی میں آپ لوگوں کے ساتھ ''رازِ زندگی'' شیئر کر رہا ہوں۔ میں مشکور ہوں اپنے اساتذہ کا ہر اُس انسان کا جس سے میں پہلی بار ملا بھلے وہ بزرگ ہستی تھے، نوجوان افراد تھے، خوبصورت چہرے تھے، معصوم بچے تھے، میں نے سب سے بہت کچھ سیکھا کیونکہ انسان جب بھی کسی سے پہلی دفعہ ملتا ہے اُس کی زندگی کا ایک نیا کردار شروع ہو جاتا ہے ایسے بے شمار کردار انسان اپنے مرنے تک ادا کرتا رہتا ہے اور اِن کرداروں کو نبھاتے نبھاتے ایک بڑا اداکار بن جاتا ہے۔
مجھے نہیں پتا کہ میرے اندر وہ صلاحیت پیدا ہو سکی جو کہ ایک بڑے اداکار بننے والی ہوتی ہے مگر مجھے اتنا یقین ہے کہ اس کائنات کا سب سے بڑا مصنف رب العالمین ہے اُسی کے لکھے ہوئے ڈائریکٹ کیے ہوئے ڈرامے میں پوری کائنات اور پوری انسانیت اداکاری اور کام کر رہی ہے، یہ ڈرامہ ازل سے شروع ہوا ہے اور ابد تک چلتا رہے گا، اور ڈرامے کا ایک میں بھی چھوٹا سا اداکار ہوں جو کہ اپنی بساط کے مطابق آپ کے سامنے ''رازِ زندگی'' لے کر حاضر ہوا ہے۔۔۔۔

زمین ایک ہے اور آسمان کتنے ہیں
میرے وجود کے اندر جہان کتنے ہیں
تمام عمر اسی جستجو میں گزری امین
پتہ چلے تو سہی امتحان کتنے ہیں

فقط دُعا گو!

امین کنجاہی 10 ستمبر 2021ء

جو ہیں انسان وہ انسانیت سکھاتے ہیں۔۔۔۔

کوئی ہندو کوئی مسلم کوئی عیسائی ہے
سب نے انسان نہ بننے کی قسم کھائی ہے

ہمارے ملک میں حقوق کی بحث کبھی ختم ہی نہیں ہوئی جب اس بحث کا دائرہ مرد اور عورت کے حقوق تک پھیلایا جائے تو پھر ایسا لگتا ہے جیسے دو جنگجو قومیں آمنے سامنے ہیں اور بات صرف فتح و شکست تک ختم نہیں ہوتی بلکہ نوبت مارنے کاٹنے اور ایک دوسرے کو ملیا میٹ کرنے تک جا پہنچتی ہے۔ معاشرے کا یہ رویہ انتہائی افسوسناک، قابل مذمت اور رب کی ناشکری کی انتہا تک پہنچا ہوا ہے اور کوئی بھی ایسا نہیں جو پانی کا کام کرے، سب جلتی پر تیل کا کام کرتے ہیں اور اس پر فخر اور ''کاروبار'' بھی کرتے ہیں۔ بہر حال ہمیں اس پر بحث نہیں کرنی، ہمیں رب کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرنا ہے کہ اس نے ہمیں انسان بنایا، اشرف المخلوقات کے عظیم عہدے پر سرفراز فرمایا، عقل و شعور کی نعمت سے نوازا، ہمارے لیے زمین، آسمان، سورج، چاند، ستارے، آگ، پانی، ہوا، پہاڑ، دریا، سمندر، نباتات، حیوانات کیا کیا نعمتیں تخلیق نہیں کیں اور کہیں بھی تفریق سے کام نہیں لیا۔ ہمیں تو ان نعمتوں کا شکر ادا کرتے نہیں تھکنا چاہیے لیکن ہم ہیں کہ نفاق، اونچ نیچ، کمتری، برتری، تیری، میری، میں اس بری طرح الجھ چکے ہیں کہ مرد اور عورت کی بحث میں انسان اور انسانیت کے شرف کو ہی بھلا بیٹھے ہیں اور بھٹکتے جا رہے ہیں، ہم نے سیدھا راستہ ہی نہیں چھوڑا بلکہ راستے ہی جدا کر لئے۔۔۔۔۔8 مارچ 2021ء کو اعلیٰ و ادنیٰ کی بحث کو میں نے اپنے ایک شعر میں کچھ اس طرح سمیٹا تھا کہ

مرد و زن کی بحث میں نہیں اُلجھاتے ہیں
جو ہیں انسان وہ انسانیت سکھاتے ہیں

آپ اپنے مرد ہونے پر فخر کریں کوئی بری بات نہیں، خواتین اپنے عورت ہونے پر نازاں رہیں کوئی بری بات نہیں۔۔۔۔لیکن جب آپ انسان بن کر نہ رہیں، انسان بن کر نہ سوچیں، انسان بن کر فیصلے نہ کریں تو یہ بہت بری بات ہے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے آپ صرف اپنا نہیں بلکہ پورا

معاشرے کا توازن خراب کر رہے ہوتے ہیں، بگاڑ کا، انتشار کا باعث بن رہے ہوتے ہیں۔۔۔ آپ سب کچھ بنیں لیکن سب سے پہلے انسان بننے کی کوشش کریں۔۔۔۔ تمام بحثیں، تمام کدورتیں، تمام نفرتیں، تمام تنزلیاں خود بخود ختم ہو جائیں گی۔

ہمیں مرد و زن کی بحث میں نہیں اُلجھنا، گفتگو کا دائرہ صرف اور صرف انسان اور انسانیت تک محدود رکھنا ہے۔ انسانی عادتوں میں سخاوت کو بڑا مقام حاصل ہے، افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ کہیں نہ کہیں ہم سے یہ منزل بھی چھوٹتی جا رہی ہے۔ سخاوت کا مطلب اپنے مال کو غریبوں، ضرورت مندوں کو دینا ہے، لیکن ہماری تمام تر توانائیاں دینے کی بجائے لینے پر صرف ہو رہی ہیں یعنی ہم اُلٹا چل رہے ہیں۔ باوجود اس کے انسان اپنے کو پہچاننے میں ناکام رہا ہے، خواجہ میر درد کہتے ہیں

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

درد دل ہی تو نہیں رہا معاشرے میں۔۔۔ تمام مسائل کی وجہ ہی یہ ہے۔ انسانیت کے دشمنوں نے کیا کیا نہیں کیا، دیوار برلن بنائی، کوریا کو دنیا کی سب سے بھاری فوجی سرحد سے بانٹا، لاکھوں انسان روس کے طول وعرض میں مار ڈالے، جاپان پر ایٹم بم گرائے، ویت نام میں، کوریا میں، لاطینی امریکہ میں، عراق میں، افغانستان میں برما میں، بوسنیا میں، مقبوضہ کشمیر میں، تقسیم برصغیر میں، الغرض جہاں دیکھو وہاں انسانی خون کے دریا بہائے گئے۔ جنگ عظیم اول میں 3 کروڑ اور جنگ عظیم دوئم میں 7 کروڑ انسان مرے اور اس کے بعد ہونیوالی سرد جنگ میں کم وبیش 100 کے قریب جنگیں ہوئیں۔ ان میں ہونیوالی ہلاکتوں کے تخمینے بھی خوفناک ہیں۔ کیا یہ سب جنگیں انسانیت کیساتھ ظلم نہیں تھیں؟ ان کا حساب کون دیگا۔۔۔؟ کون ہے جوابدہ۔۔۔؟ کون ہے ظالم۔۔۔؟

الطاف حسین حالی نے کہا تھا کہ

فرشتے سے بڑھ کر ہے انسان بننا
مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ

اور محنت ہم چھوڑ بیٹھے ہیں۔ دینِ اسلام میں انسانی حرمت وشرافت کی کتنی پاسداری ہے اس کا

اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انسان کا احترام موت کے بعد بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو عقل وخرد کی بیش بہا دولت سے نوازا ہے جس کی بدولت وہ ساری کائنات پر حکمرانی کرتے ہیں، عقل وخرد سب انسانی خوبیوں اور کمالات کا سرچشمہ ہے، ارشاد نبویؐ ہے: ''اللہ کی تمام پیدا کردہ چیزوں میں عقل اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ باعزت ہے۔'' اسی اہمیت کے پیش نظر اسلام نے عقل کی حفاظت پر خصوصی توجہ دی ہے کہ عقائد اور اخلاق واعمال میں اعتدال سے ہی قائم رہتا ہے اور انسان کیلئے حقوق وفرائض کی انجام دہی آسان ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں جگہ جگہ عقل کے استعمال اور تفکر کی دعوت دی گئی ہے تاکہ انسان کائنات اور اس کے نظام پر غور وفکر کر کے نظام الٰہی اور پیام ربانی کی حقانیت کا اعتراف کرے اور اس کے مطابق زندگی استوار رکھنے کا عہد کرے۔

اسلام دینِ رحمت ہے، بلاتفریق قوم ومذہب تمام انسانوں پر رحم وکرم اس کی خصوصیات میں داخل ہیں، اسلام کے علاوہ کسی اور مذہب یا تہذیب میں انسانیت نوازی اور عام انسانوں پر رحم وکرم کا وہ تصور نہیں ملتا۔ محسن انسانیتؐ ارشاد فرماتے ہیں: ''رحم کرنے والوں پر اللہ رحم کرتا ہے، تم زمین والوں پر رحم کرو، تم پر آسمان والا رحم کرے گا۔'' (صحیح بخاری)

ارشادِ نبویؐ ہے ''ایک دوسرے سے قطع تعلق نہ کرو، نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو، آپس میں بغض وعداوت نہ رکھو، باہمی حسد نہ کرو اور اللہ کے بندے بھائی بھائی بن جاؤ۔'' (سنن ترمذی) اسلام احترامِ انسانیت اور امن وسلامتی کا علم بردار ہے۔ انسان دوستی اور احترام انسانیت دین اسلام کا امتیاز اور بنیادی شعار ہے جس کے بغیر احترام انسانیت اور امن وسلامتی کا تصور بھی محال ہے۔

غالب نے کہا تھا:

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اور پھر یہ کہ۔۔۔ آدمی کے پاس سب کچھ ہے مگر ایک تنہا آدمیت ہی نہیں۔۔۔ مسئلہ یہ ہے کہ آج کی دنیا آدمیوں سے بھری پڑی ہے لیکن انسان کم دکھائی دیکھتے ہیں۔ ندا فاضلی نے اسی کو دیکھتے ہوئے کہا تھا کہ

ہر طرف، ہر جگہ بے شمار آدمی
پھر بھی تنہائیوں کا شکار آدمی

صبح سے شام تک بوجھ ڈھوتا ہوا
اپنی ہی لاش کا خود مزار آدمی

ہر طرف بھاگتے دوڑتے راستے
ہر طرف آدمی کا شکار آدمی

روز جیتا ہوا روز مرتا ہوا
ہر نئے دن نیا انتظار آدمی

گھر کی دہلیز سے گیہوں کے کھیت تک
چلتا پھرتا کوئی کاروبار آدمی

زندگی کا مقدر سفر در سفر
آخری سانس تک بے قرار آدمی

آج سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقیات کے اعتبار سے بام عروج پر پہنچنے والی دنیا اور مشین پر جینے والے انسان کا عالم یہ ہے کہ

اے آسمان تیرے خدا کا نہیں ہے خوف
ڈرتے ہیں اے زمین ترے آدمی سے ہم

پھر آج کے دور کے انساں کی حالت زار کو ندا فاضلی اپنے ایک شعر میں کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ

گرجا میں مندروں میں اذانوں میں بٹ گیا
ہوتے ہی صبح آدمی خانوں مین بٹ گیا

آخر میں بس اتنا کہ ہماری ساری بحث وتمہید سے شائد آپ ''رازِ زندگی'' پا گئے ہوں۔۔۔

مقصد صرف اتنا ہے کہ ایک دوسرے کو مت بانٹو۔۔۔ایک دوسرے کیلئے بانٹو۔۔۔

زندگی کا مقدر بدل ڈالو۔۔۔ بھاگتے دوڑتے راستوں پر ایک دوسرے کا شکار مت کرو۔۔۔

زندگی کو بوجھ مت بناؤ۔۔۔ انسان بنو۔۔۔اور انسان بناؤ

طیبہ بخاری
مدیر اپبلشر
مکتبۂ پاک ادب

زندگی امتحان لیتی ہے

آج میرے بھانجے کے گھر بیٹا پیدا ہوا یہ اُس کا پہلا بچہ ہے تمام گھر اور خاندان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی مٹھائیاں لائی جارہی ہیں کھلائی جارہی ہیں تقسیم کی جارہی ہیں میری بہن اپنے میاں کو کہہ رہی ہے کہ عقیقہ جلدی کرنا ہے اس میں دیر نہیں لگانی۔ ہم سب خاندان والے بہت خوش ہیں کہ رب تعالیٰ نے خاندان میں ایک اور ننھا فرشتہ بھیج دیا ہے اولاد کی خوشی اور وہ بھی اولادِ نرینہ خاندان میں بے تحاشا جوش وخروش کا اظہار کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ہماری نسل اور آگے بڑھ گئی ہے۔ اِس سارے ماحول کو میں بہن کے گھر ڈرائنگ روم میں بیٹھا دیکھ رہا ہوں سوچ رہا ہوں کہ یہ بچہ جو آج پیدا ہوا ہے آج سے تقریباً 28 برس پہلے اسی گھر میں اس بچے کا باپ پیدا ہوا تھا اور ہم سب نے اسی طرح خوشی اور جشن منائے تھے اور پھر آج دوبارہ اسی گھر میں ایک اور وارث کے آنے سے رونق بڑھی ہے۔

میری بہن کے بڑے بیٹے کے بچے یہ نعرے لگا رہے تھے کہ "تبدیلی آئی نہیں تبدیلی آچکی ہے" میں اب اس بچے کی زندگی کے بارے میں سوچ میں پڑ گیا ہوں ایک اور سفر زندگی کا جس میں اس بچے نے ماں کی گود سے لے کر پہلا قدم اُٹھانے تک باپ کی انگلی پکڑ کر سکول جانے تک اور سکول سے کم سے کم دس برس کی پڑھائی پڑھنے کے بعد کالج میں داخل ہونے تک اور پھر آگے یونیورسٹی اور پھر یونیورسٹی کے بعد نوکری کی تلاش۔ اس سارے دورانئے کو گزرنے میں تقریباً شاید پھر 24 برس گزر جائیں اور پھر نا جانے اُس وقت میں کہاں ہوں لیکن مجھے یہ یقین ضرور ہے کہ اس بچے کے شادی ہونے تک اور پھر اس کے ہاں کوئی نیا ننھا فرشتہ آنے تک یقیناً میں زندہ نہیں رہوں گا کیونکہ میری زندگی کی فصل جو میرے ماں باپ نے میرے وجود کی صورت میں بوئی تھی وہ اب پک کر تیار ہو چکی ہے اور وقت کی سردی گرمی بہار خزاں دھوپ چھاؤں سے ہوتی ہوئی اب کٹائی کیلئے تیار ہے اور اب کائنات کا جو مالک ہے جو اس دنیا کا رب ہے جب بھی اُس کا حکم ہوا کسی

وقت بھی میری باری آجائے گی اور مجھے بھی تمام دوسرے لوگوں کی طرح اور عام انسانوں کی طرح مٹی کے سپرد کر دیا جائے گا۔ مگر زندگی کی خواہش بڑی ظالم ہوتی ہے انسان اس دنیا سے رخصت ہونا نہیں چاہتا بھلے وہ کتنی ہی تکلیف میں کیوں نہ ہوں بھلے اُسے کتنے ہی مسائل کیوں نہ درپیش ہوں بھلے وہ کتنی ہی غربت اور تنگ دستی میں ہی زندگی گزار رہا ہو مگر وہ دنیا کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔

دنیا ایک ایسا خوبصورت خواب ہے جو انسان جاگتی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ یہ خواب یونہی ہمیشہ چلتا رہے اور اُس کی آنکھ کبھی نہ کھل سکے مگر ایسا ہونا ممکن نہیں۔ جو نفس اس کائنات میں آیا ہے اُس کو فنا ہے اُس نے واپس لوٹ کر جانا ہے اُس کی تگ و دو، زندگی سے محبت اُس کی خواہشات کبھی بھی مکمل نہیں ہو پاتیں۔ ہر دفعہ وہ اپنے دل میں رب سے یہ دُعا کرتا ہے کہ اے اللہ پاک! ابھی میرے بچے چھوٹے ہیں یہ بڑے ہو جائیں تو میں اس دنیا سے چلا جاؤں تو خیر ہے پھر جب بچے بڑے ہو جاتے ہیں تو وہ اللہ پاک سے دُعا کرتا ہے کہ میں اپنے بچوں کی شادیاں دیکھ لوں خوشیاں دیکھ لوں تو پھر بھلے تو مجھے اپنے پاس بُلا لینا۔ جب یہ مرحلہ بھی مکمل ہو جاتا ہے تو انسان رب سے دُعا کرتا ہے کہ اے مالک مجھے اتنی مہلت تو دے کہ میں اپنے بچوں کے بچوں کو گود میں کھلا سکوں اور یوں ایک لامتناہی خواہشوں کا سلسلہ چلتا ہی رہتا ہے نہ ختم ہونے والا۔ مگر رب نے ہر انسان کے اندر ایک الارم فٹ کر رکھا ہے اور ہر بندے کا الارم اپنے وقت پر بولتا ہے، وہ اس طرح کہ جب رب کے حکم سے ایک مقررہ وقت پر ہر شخص کا دل دھڑکنا بند ہو جاتا ہے اور وہ خاموشی کا لبادہ اوڑھ کر اپنے گھر والوں کے بیچ میں میت کی صورت پڑا ہوتا ہے اور پھر وہی اُس کے بچے اُس کی بیوی بہن بھائی رشتہ دار جو اُس کی دھڑکن چلنے تک اُس کو ابو جی، بھائی جان، ماموں، کہہ کر پُکارتے تھے اُسے میت کہنے لگتے ہیں۔

یہ کیا زندگی ہے یہ کیا سلسلہ ہے کبھی آپ نے غور کیا دنیا جو کہ ایک امتحان گاہ کی طرح ہے جس میں سب انسان اپنی اپنی اہلیت اور قابلیت کے مطابق پرچہ حل کر رہے ہیں اور دنیا ایک کلاس روم ہے ہم سب نے اپنے پرچے حل کر کے اس کلاس روم سے چلے جانا ہے اور اس کا رزلٹ ہمیں یوم حشر بتایا جائے گا میرے نزدیک زندگی امتحان لیتی ہے لوگوں کی جان لیتی ہے۔

فلاح

سائنسدانوں کی ابھی تک کی معلومات کے مطابق کرۂ ارض پر نباتات، جمادات اور حیوانات پائے جاتے ہیں، زمین کو بنے ہوئے کئی ہزار سال ہو چکے ہیں بے شمار قیاس آرائیاں اور مفروضے بتائے جاتے ہیں اور قائم کئے جاتے ہیں کہ دنیا کس طرح عالم وجود میں آئی؟ کوئی کہتا ہے کہ ایک بگ بین ہوا اُس کے بعد ہماری کائنات جس کے اندر ہماری کہکشاں ہے اُس کے اندر کا نظام شمسی قائم ہوا اور اُس میں سے ایک نظام شمسی کا سیارہ زمین قرار پائی۔ یہ تو دنیاوی اور سائنسی خیالات اور بیانات ہیں جب کہ اگر ہم اپنی دینی کتاب قرآن پاک کے حوالے سے پڑھیں دیکھیں اور غور کریں تو اللہ پاک نے فرمایا ہے کہ میں نے کائنات کو اور زمینوں آسمان کو سات دن میں قائم کیا اور پھر اُس میں آدم کی تخلیق، آدم کو مٹی سے بنایا گیا اور مٹی بھی وہ کھنکتی مٹی اور پھر اُس میں اپنی روح پھونکی اور پھر جن وملائکہ کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں۔ اِس موقع پر آپ سب جانتے ہیں ابلیس جو کہ جنوں میں سے تھا اُس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ آدم تو مٹی سے بنایا گیا ہے یہ مجھ سے کم تر ہے مجھے آگ سے پیدا کیا گیا ہے میں آدم سے افضل ہوں میں آدم کو سجدہ نہیں کروں گا۔ مگر رب نے ابلیس کو کہا کہ تمہیں سجدہ کرنا پڑے گا جس پر ابلیس نے انکار کر دیا اور اِس کی پاداش میں رب تعالیٰ نے ابلیس کو ابد تک دھتکار دیا۔ ابلیس نے رب سے کہا کہ اے رب یہ جسے تو اپنا نائب بنا کر زمین پر بھیج رہا ہے یہ تیری کائنات میں شر پیدا کرے گا، قتل وغارت گری کرے گا پوری کائنات کیلئے گمراہی اور بدنامی کا باعث بنے گا۔ مگر اللہ نے کہا کہ اے ابلیس نہیں یہ میرے اچھے بندوں میں ثابت ہوگا اور دنیا میں جا کر یہ اپنے لوگوں کیلئے آسانیاں پیدا کرے گا ہاں وہ چند لوگ جن کے دلوں پر مہریں لگا دی جائیں گی وہ میری نافرمانی ضرور کریں گے لیکن آج سے تُو اے ابلیس ابد تک دربدر پھرتا رہے گا۔ اس پر ابلیس نے رب سے مہلت مانگی اور

وعدہ کیا کہ اے رب مجھے اتنا وقت دے کہ میں تیرے بندوں کو ورغلاتا رہوں اور اُن کو غلط کاموں اور گناہوں کی طرف راغب کرتا رہوں۔

اس پر رب تعالیٰ نے ابلیس کو یوم حشر تک کا وقت دے دیا اور کہا کہ جا اور اپنی کوشش کر کے دیکھ مگر تجھے کامیابی حاصل نہیں ہوگی کیونکہ جو میرے پیارے اور نیکوکار بندے ہونگے وہ تیرے بہکاوے میں نہیں آئیں گے اور پھر اس طرح زندگی کا سفر شروع ہو گیا۔ حضرت آدمؑ جنت میں رہ رہے تھے اُداس تھے اکیلے رہ گئے تھے جب رب نے دیکھا کہ وہ اکیلے ہیں اُداس ہیں تو رب نے حضرت حواؑ کو پیدا فرمایا۔ ابلیس نے اِن کو اپنے پہلے بہکاوے میں لیا جس کی پاداش میں حضرت آدمؑ کو رب تعالیٰ نے جنت سے زمین پر منتقل کر دیا۔ اور پھر ہماری دنیا کی زندگی شروع ہو گئی، اولادِ آدم کی پیدائش افزائش نسل اور کاروبارِ زندگی شروع ہو گئی۔ زمین پر رب نے پہاڑ قائم کر دیئے باغات لگا دیئے اور نسل آدم کو آسائشیں دینا شروع کر دیں مگر ساتھ ساتھ ابلیس نے بھی اپنا کام جاری رکھا۔

آج کے دور تک پہنچتے پہنچتے گو کے بے شمار ترقیاتی اور معلوماتی اور سائنسی علوم پر کام ہو چکا ہے اور عقل کے حوالے سے دنیا نے بہت ترقی کر لی ہے اور بے شمار نظریات نے جنم لے چکے ہیں جس میں کہ شیطانی قوتیں انسان کو نیک کاموں سے روکنے میں مشغول ہیں مگر رب کے فرمان کے مطابق رب کے نیک بندے جن میں سب سے افضل ترین ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنہیں رب العالمین نے پورے جہانوں کیلئے رحمت بنا کر بھیجا ہے اُن کی وجہ سے اور اُن نیک لوگوں کی وجہ سے جو اُن کے زیر تربیت رہے اور جن کے بارے میں رب کریم نے قرآن میں فرمایا ہے کہ میرے چند لوگوں میں سے ایسے لوگ ہوں گے کہ جن کی وجہ سے بنی نوع انسان کو عظمت اور اعلیٰ مقام ملتا رہے گا ربِ کائنات اور رب کے نبی کی محبت سے سرشار پوری بنی نوع انسانیت کو نیکی کی طرف بلائیں گے راغب کریں گے اور شیطانی قوتوں کو شکستِ فاش دیں گے اور کائنات میں امن سکون برداشت اور درگزر کا ماحول پیدا کریں گے۔ ایک دوسرے کو معاف کریں گے، ایثار اور قربانی کا جذبہ رکھیں گے اپنے ذاتی مفادات کو اللہ اور اُس کے رسولؐ کے تابع رکھیں گے ایسے ہی لوگ فلاح پائیں گے۔

پیار محبت

پیار کیا ہے؟ یہ کوئی آج تک واضح نہیں کر سکا پیار کی اقسام کتنی ہیں؟ کیا پیار چشموں کی صورت میں ہوتا ہے؟ یا پیار دریاؤں کی صورت میں یا پھر پیار ایک سمندر ہے؟ آپ سوچ رہیں ہوں گے پیار کی بات کر رہا ہے اور ساتھ میں چشموں دریاؤں اور سمندر بیچ میں لے آیا ہے دراصل ایک نصف صدی ہوگئی ہے مجھے بھی اس کاروبار زندگی میں مگر میں آج تک پیار اور محبت کا مفہوم اور معنی عملی طور پر نہیں سمجھ سکا شاید یہ میری کم علمی ہے یا میں نالائق ہوں میرے اندر وہ صلاحیتیں موجود نہیں جو کہ پیار اور محبت کو کھل کر میری روح کے اندر بیان کر سکیں

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ پیار اور محبت کا جو لفظ ہے کیا وہ صرف انسانی روح سے ہی تعلق رکھتا ہے یا اُس میں انسانی بدن کا بھی کوئی حصہ ہوتا ہے جب بھی میں نے اپنے بڑوں سے اپنے بابوں سے اس موضوع پر بات کی تو انھوں نے ہمیشہ یہی حکم دیا کہ پیار محبت دینے کا نام ہے، اُس میں آپ نے اپنے سے دینا ہے، اپنے پیاروں کو جن سے آپ محبت کرتے ہیں جن کی خاطر آپ زندہ رہنا چاہتے ہیں جن کے ایک اشارے پر آپ اپنا سب کچھ قربان کرنے کیلئے تیار ہو جاتے ہیں اور جن کے بارے میں آپ سوچتے ہیں آپ کے دل کی دھڑکن اور وہ دھڑکن کہ جس کے ہر لمحہ دھڑکنے سے آپ اپنے پیاروں کے بارے میں غور کرتے ہیں اُن کیلئے بلاخوف وخطر بغیر کسی خودغرضی کے اپنی زندگی کی تمام آسائشیں اور سہولتیں قربان کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔

یہ محبت یہ پیار اُس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک کہ ہم اپنے پیاروں کو حاصل نہیں کر لیتے اگر یہ پیار حاصل کرنے کے بعد بھی رہے اور یہی رویئے ہمارے پورے وجود میں قائم رہیں اور ہم ایک دوسرے کو اُس کی خامیوں اور خوبیوں سمیت برداشت کریں اُس کی غلطیوں کو درگزر کریں اُس کے اندر جو خوبیاں ہیں اُن کو اُجاگر کرنے کی کوششیں کریں اور جو خلوص اور جذبہ ہمارے وجود کے اندر اُسے حاصل کرنے سے پہلے موجود تھا اُس کو ہم قائم رکھیں اور اُس میں مزید اضافہ کریں اپنے

رشتہ داروں میں اپنے دوستوں میں اپنے محلے داروں میں اپنے معاشرہ میں اپنے شہر کے لوگوں میں اپنے ہم زبانوں میں اپنے بچوں میں، تربیت اُن کو ایسی دیں میں تو کہوں گا اپنے بچوں کو جب سکول میں داخل کروانے کیلئے جاتے ہیں تو اُن کو کم از کم پانچ برس کی عمر میں داخل کرایا جائے کیونکہ اگر ہم انھیں اڑھائی برس کی عمر میں تین برس کی عمر میں پلے گروپ میں شامل اور داخل کروا دیں گے تو اُن کے اندر ماں باپ کے ساتھ پیار کا رشتہ اتنا مضبوط نہیں ہو سکے گا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی فرمایا ہے کہ بچوں کو جب بھی تعلیم دلوانا شروع کرو تو کم از کم پانچ برس کی عمر میں مدرسہ سکول یا مسجد میں بھجواؤ تا کہ وہ پہلے پانچ برس اپنے والدین کے گھر میں رہتے ہوئے اُن کی گود اور اُن کے ماحول میں خاموشی سے وہ تربیت حاصل کر سکیں جو کہ میرے نزدیک وائی فائی کا کام کرتی ہے جس طرح ہم اپنے موبائلز کو وائی فائی کے ساتھ کنکٹ کرتے ہیں اُس کا پاس ورڈ ہوتا ہے وہ جب ہم لگاتے ہیں تو وہ آن ہو جاتا ہے اسی طرح میرا موقف ہے کہ بچے کم از کم پانچ برس اپنے والدین کی تربیت میں رہیں تا کہ اُن کے اندر کا وہ وائی فائی آن ہو جائے، ماں باپ کے ساتھ محبت اور پیار کا خمیر مضبوط ہو سکے اور وہ ماں باپ سے پیار کو اپنے اندر منتقل کر سکیں اور پھر جب وہ سکول، مدرسہ جائیں عملی زندگی میں جائیں تو اُن کو محبت خلوص اور پیار سمجھنے میں آسانی ہو کیونکہ پیار اور محبت ایسا خوبصورت جذبہ ہے جس کی نہ کوئی حد ہے نہ کوئی انتہا ہر انسان اپنے اندر اس جذبے کو محسوس کرتا ہے اور اس جذبے کو ظاہر کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ بعض انسانوں میں یہ جذبہ منفی انداز سے ظاہر ہوتا ہے اور بعض لوگ اس جنگل میں ایسے گم ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنی شناخت بھی بھول جاتے ہیں۔ کاش ہم محبت کے مفہوم کو اُجاگر کر سکیں، کاش ہمارے معاشرے میں پیار اور خود غرضی نہ ہو، سودا نہ ہو، لین دین نہ ہو، کاروبار نہ ہو، دھوکہ نہ ہو، ایمانداری ہو، خلوص ہو، جھوٹ نہ ہو، منافقت نہ ہو، پیار ہی پیار ہو، محبت ہی محبت ہو، ایسی محبت جس میں پورا معاشرہ رنگ جائے سب کو آسائشیں ملیں۔ ہمارے گھر رشتے اور معاشرے مضبوط ہو جائیں کیونکہ پیار وہ جذبہ ہے وہ احساس ہے جسے ہم خلوص نیت سے اپنا لیں تو ہم پر سکون معاشرہ قائم کر سکتے ہیں۔ اللہ پاک ہمیں زندگی گزارنے کا طریقہ سلیقہ عطا فرمائے۔ آمین

داستان سرائے

پچھلے چند برسوں سے میری اور میرے دوست ڈاکٹر حبیب الرحمٰن کی ملاقات بہت کم ہوتی ہے کیونکہ وہ 2000ء سے جہلم شہر منتقل ہو چکے ہیں اور پھر اُن کا پروفیشن بھی میڈیکل کا ہے جس میں اُنہیں تقریباً 13,13 گھنٹے مسلسل کام کرنا پڑتا ہے جب وہ اسلام آباد میں ہوتے تھے تو ہم ہفتے میں ایک دو بار ضرور مل لیا کرتے تھے اور اپنے دکھڑے شیئر کیا کرتے تھے پھر نوکری کے سلسلے میں وہ جہلم شفٹ ہو گئے میں راولپنڈی گجرات، کنجاہ اور جلال پور جٹاں میں بٹ کر رہ گیا کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے جیسے ڈاکٹر حبیب میرا ہمزاد ہے کیونکہ میری اور اُس کی دوستی 45 سال پر محیط ہے اتنی لمبی اور اتنی گہری دوستی شاید آج تک میں نے سوائے اپنی زندگی کے علاوہ کسی اور کے ساتھ نہیں نبھائی۔ اس ساری تمہید کا مقصد آپ کو بتانا صرف یہ مقصود ہے کہ جب سے وہ جہلم گیا ہم دونوں میں رابطہ پہلے خط کے ذریعے ہوا کرتا تھا میرے پاس موبائل تھوڑا لیٹ آیا اُس کے پاس تو پہلے سے تھا۔ پھر ہم دونوں فون پر بات کر لیا کرتے مگر فون پر بھی اتنی لمبی بات نہیں ہو پاتی اور نہ ہی کھل کر ایک دوسرے کے ڈپریشنز شیئر ہو سکتے تھے۔

ایک دن چند برس پہلے مجھے حبیب نے فون کیا کہ یار لاہور چلنا ہے مگر شرط یہ ہو گی مہینے کا پہلا ہفتہ ہو جب بھی ہم لاہور جائیں۔ ہم دونوں نے یہ طے کیا کہ ہر دو تین ماہ کے بعد مہینے کے پہلے ہفتے لاہور جایا کریں گے 05 جولائی کو مجھے ڈاکٹر کا فون آیا اور اُس نے اپنے روایتی انداز میں کہا لاہور جانا ہے میں نے کہا ہاں! ضرور جانا ہے تو اُس نے کہا کہ جمعہ کی شام تم جہلم آ جاؤ تو ہم دونوں اکٹھے ہفتے کی صبح لاہور نکل جائیں گے۔ میں نے کہا نہیں یار میں جہلم نہیں آؤنگا مجھے کنجاہ گئے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا ہے اس طرح کرتا ہوں کہ میں جمعہ کو دفتر کے بعد کنجاہ چلا جاؤں گا تم مجھے

ہفتے کی صبح کنجاہ سے لے لینا۔ بات طے ہوگئی اور میں نے فون بند کر دیا 6 جولائی کو جمعہ پڑھنے کے بعد میں نے ٹیکسی گھر سے کروائی فیض آباد سے اب تو ویگن کے اڈے اُٹھا دیئے گئے ہیں اس لئے مجھے گجرات کے اڈوں کا نہیں پتا تھا کہ وہ کہاں منتقل ہو گئے ہیں میں نے ٹیکسی والے کو کہا کہ مجھے پیرودھائی کے قریب جہاں گجرات کے اڈے شفٹ ہوئے ہیں وہاں چھوڑ دو ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے اڈے پر اُتار دیا میں نے ویگن کا ٹکٹ لیا ایک سیٹ پر بیٹھنا میرے لئے مشکل ہوتا ہے لہٰذا میں نے ویگن کی دونوں فرنٹ سیٹیں اپنے پاس رکھ لیں لاہور جانے کا ہم دونوں کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہم جب ایک دوسرے کے ساتھ کار میں بیٹھتے ہیں تو بے مقصد بات چیت کرنے لگ جاتے ہیں جس کا کوئی سر پیر نہیں ہوتا۔ کبھی واٹس ایپ کلپ دیکھتے ہیں، کبھی عارفانہ کلام سنتے ہیں، کبھی لطائف شیئر کرتے ہیں۔ گجرات سے لاہور تک کا سفر اسی قسم کی حرکات کرتے گزر جاتا ہے راستے میں بھوک لگتی ہے تو کبھی ڈھابے سے ناشتہ کر لیتے یا کسی بیکری سے جوس وغیرہ لے کر پی لیتے ہیں۔

لاہور جانے کا مقصد ادبی دوستوں سے ملنا ملانا ہوتا ہے اس دفعہ میرا خاص مقصد یہ تھا کہ داستان سرائے 121 سی ماڈل ٹاؤن لاہور جانا تھا، میں نے حبیب کو بتا دیا تھا اس نے کہا ٹھیک ہے میں ہوٹل جا کر سو جاؤں گا۔ داستان سرائے اس لئے جانا تھا کیونکہ وہاں اشفاق بابا جی، قدسیہ ماں جی کے حوالے سے میری بے شمار یادیں وابستہ ہیں۔ میں نے اس داستان سرائے سے بڑا فیض پایا ہے اس کا داستان گو اثیر احمد خاں میرا بہت اچھا دوست ہے اُس کا اور میرا مینٹل لیول ایک جیسا ہے گو کہ میں عمر میں اُس سے بڑا ہوں وہ 15 جون 1963ء کو داستان سرائے میں وارد ہوا اثیر احمد خان، اشفاق بابا جی اور بانو ماں جی کے تین بیٹوں میں سے سب سے چھوٹا بیٹا ہے۔ انیق احمد ،انیس احمد اور اثیر احمد۔ انیق امریکہ میں ہے، انیس ابھی چند ماہ پہلے ہمیں چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے، میں تو اثیر کو سجادہ نشین کہتا ہوں کیونکہ اب داستان سرائے میں داستان گوئی کا کام اثیر کے حصے میں آ گیا ہے۔ اثیر نے بابوں کے درمیان اپنی شیر خوارگی اپنا بچپن اپنا لڑکپن اپنی جوانی اور اب میں اُسے بوڑھا تو نہیں سمجھتا مگر پھر بھی بزرگی اُس کے چہرے پر دستک دے رہی

ہے۔ اُس میں وہ تمام خوبیاں بدرجا اُتم پائی جاتی ہیں جو کہ بابوں کے اندر ہوتی ہیں ملنسار ہے در گزر کرنے والا ہے اپنے سے بڑوں کی عزت کرتا ہے، موڈی ہے اور کبھی کبھی جلال میں بھی آجاتا ہے۔ میں کبھی کبھی اسے کہتا ہوں کہ تو ''جلالی بابا'' ہے مجھے تجھ سے ڈر بھی آتا ہے یہ سن کر وہ مسکرا دیتا ہے اور کہتا ہے ''کنجا ہی جان دے''۔

لاہور پہنچا تو سب سے پہلے میں نے اثیر سے بات کی اور اُس سے کہا یار میں داستان سرائے آرہا ہوں اُس نے کہا آجا میں نے حبیب کو چھوڑا اور ٹیکسی کرا کر داستان سرائے پہنچ گیا، دروازے پر ایک بچہ ملا، میں نے اُس نے کہا جاؤ اثیر صاحب کو بتاؤ کہ امین آیا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بچہ آیا اور کہا کہ آپ اندر آجائیں۔ میں داستان سرائے کے گیٹ سے پرانی یادوں کو محسوس کرتا ہوا اندر صحن میں داخل ہوا صحن سے برآمدہ برآمدے سے ڈرائنگ روم بہت بڑا کھلا کمرہ جہاں تین چار صوفے لگے ہوئے تھے دیواروں کے اوپر بابا جی اور ماں جی کی تصاویر آویزاں تھی میں کچھ دیر کے لئے اُن تصویروں سے باتیں کرنے لگ پڑا اور دل ہی دل میں دُعا کرنے لگ پڑا کہ اللہ پاک مجھے بھی یہ توفیق عطا فرما کہ میں بھی اپنی ان بزرگ ہستیوں کی طرح کچھ اچھے کام اور اعمال کرسکوں ابھی میں یہ سوچ رہا تھا کہ اثیر کمرے میں داخل ہوا کالا شلوار قمیص پہنے ہوا تھا تھوڑا وزن بھی زیادہ لگ رہا تھا مجھے آواز دی ''امین آ گیا ہے تو'' اور پھر بڑے تپاک سے جپھی ڈال کر ملا۔ سب سے پہلے اُس نے مجھ سے پوچھا ''ناشتہ کیتا ای'' میں نے کہا بس وہ دوست کے ساتھ آیا تھا ایک بیکری سے ایک چکن پیٹیز اور ایک جوس کا ڈبہ لے کر بیکری کے برآمدے میں بیٹھ کر کھایا ہے۔ پھر اُس نے ملازم کو آواز دی اور مجھ سے پوچھا ''کیا کرے گا ناشتہ؟'' میں نے کہا ''رہن دے'' اُس نے کہا انڈا کھائے گا، پراٹھے کے ساتھ، ڈبل روٹی کے ساتھ؟ میں نے کہا نہیں یار پہلے مجھے سادہ پانی پلا زیادہ ٹھنڈا نہ ہو۔ پھر اُس نے ملازم سے کہا کہ آملیٹ بنا لے اور پراٹھا، آملیٹ اور اچار چائے کے ساتھ لے آ۔ اور اپنے پینے کیلئے ایک چائے کا کپ منگوایا پھر ہم دونوں باتیں کرنے لگ پڑے ناشتہ آگیا اور میں نے ناشتہ کرنا شروع کیا جب میں ناشتہ کر رہا تھا تو اثیر مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ شاید اثیر محسوس کر رہا تھا کہ میں بہت زیادہ بھوکا ہوں، میں جلدی جلدی کھا رہا تھا میری یہ

حالت دیکھ کر اشیر نے کہا ایک پراٹھا اور منگواؤں؟ میں نے کہا نہیں یار میری عادت ہے ہر کام جلدی کرنے کی تو فکر نہ کر میں فُل ہو گیا ہوں۔ پھر میں نے اُس نے پوچھا، تیری کوئی اور مصروفیت تو نہیں ہے آج؟ اُس نے کہا نہیں میں نے شام 5 بجے قُل پر جانا ہے۔ میں نے کہا چل ٹھیک ہے باقی ٹائم میں تیرے سر پر ہوں پھر ہم دونوں مسلسل تقریباً چار ساڑھے چار گھنٹے باتیں کرتے رہے میں اشیر کی شخصیت سے پہلے ہی بہت زیادہ متاثر تھا، متاثر ہوں اور ہمیشہ متاثر رہوں گا کیونکہ اُس کے اندر روشنی ہے چمک ہے سچائی کی، حق بات کرنے کی جرأت ہے، وہ جس خاندان سے تعلق رکھتا ہے وہ اللہ والے لوگ ہیں اُن کی اللہ کے ساتھ ڈائریکٹ تار جڑی ہے اور میں بھی اسی تار کے ساتھ جڑنا چاہتا ہوں۔

میں نے اشیر کو یہ بات بتائی بھی بابا میں تیرے سے فیض پانا چاہتا ہوں تو اُس نے کہا کہ رب کے ساتھ بات کیا کر اکیلا بیٹھ کر حقوق اللہ تو اپنی جگہ مگر اُس کے علاوہ بھی یہ بہت ضروری ہے جب تک ہم ایسا نہیں کریں گے ہمارا چینل آن نہیں ہوگا۔ میں نے کہا میں تو ہر کام 33 نمبروں والا کرتا ہوں کہ بس پاس ہو جاؤں میرے پاس فرسٹ آنے کا کوئی گر اور طریقہ نہیں نہ ہی میں کوئی ٹوپرز میں سے ہوں۔ اشیر نے ہنس کر کہا کہ میں بھی 33 نمبروں والے میں سے ہوں پتا نہیں وہ مجھے حوصلہ دے رہا تھا یا میرا دل رکھ رہا تھا۔ ڈھائی تین بجے مجھے پوچھا، بھوک تو نہیں لگی ہے کھانا کھائے گا؟ میں نے کہا میں نے کچھ نہیں کھانا پھر بے شمار باتیں ہم نے کیں تصوف کے حوالے سے دنیاوی حوالے سے باطنی حوالے سے ظاہری حوالے سے۔

آپ یقین مانئے جب میں نے ٹائم دیکھا اور کہا اشیر یار اس سے پہلے مجھے تُو کہے کہ اب تو جا میری جان چھوڑ یا ہماری گفتگو میں یہ موضوع شروع ہو جائے اور سناؤ کیا حال ہے یار موسم بڑا گرم ہو گیا ہے میں نہیں چاہتا اس طرح کی گفتگو ہو۔ میں نے اشیر سے اجازت لی دوبارہ ملنے کا کہا اُس نے کہا کل صبح آ جائیں مگر اچانک پھر مجھے اسی رات واپس آنا پڑا اور میں نے اشیر کو واٹس ایپ کر دیا کہ یار یہاں بھی 33 نمبر والا مسئلہ آ گیا ہے۔

وہ واحد ہے

پوری کائنات پر اگر غور و فکر کیا جائے اور غور و فکر کرنا بھی چاہیے کیونکہ اس کا ہمیں حکم دیا گیا ہے اس حکم میں بنی نوع انسان کیلئے بے شمار معلومات اور فائدے ہیں۔ آج اچانک بیٹھے بیٹھے میرا دھیان مجھے ایک سوچ کی طرف لے گیا جو کہ ہر انسان کو زندگی میں ایک نہ ایک دن ضرور ذہن میں آتی ہو گی آپ سوچ رہے ہوں گے کہ وہ کون سی ایسی سوچ ہے جس کے بارے میں، میں آپ سے بات کرنے جا رہا ہوں جناب وہ سوچ ہے دن اور رات کے بارے میں، صبح اور شام کے بارے میں، چاند اور سورج کے بارے میں، زمین اور آسمان کے بارے میں، غرضیکہ آپ اس کے بارے میں سوچتے چلیں جائیں آپ کو ہر ہر شے کا جوڑا ملے گا۔

پوری کائنات میں رب نے ہر ایک کا جوڑا بنایا ہے اور یہ سلسلہ انسانوں، جانوروں، پرندوں اور آبی مخلوقات میں بھی پایا جاتا ہے۔ آپ جس کے بارے میں بھی سوچیں وہ جوڑے کی شکل میں ہی ملے گا اور اگر جوڑا نہیں ہے تو صرف ایک رب العالمین کے حوالے سے نہیں ہے کیونکہ اللہ ایک ہے اور اُس کا کوئی شریک نہیں وہ اکیلا ہے تنہا ہے ہمیشہ سے تھا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا کیونکہ اُسے اپنے آپ کو اکیلا رکھنے میں قدرت حاصل ہے اور وہ اس پر تکبر بھی کرتا ہے اور تکبر کرنے کا صرف اور صرف حق اگر کسی کو پوری کائنات میں حاصل ہے تو وہ اللہ واحد لاشریک کو حاصل ہے اور اس کے بارے میں اللہ نے بار بار ارشاد فرمایا ہے کتابیں رسول دنیا میں بھیجے ہیں کہ جن میں بار بار یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک مت کرنا اُس کے ساتھ اگر کوئی شریک ٹھہرایا جائے گا تو وہ شرک کرنے والوں میں شامل ہوگا اور شرک کرنا ایک ایسا گناہ

ہے جس کی معافی رب تعالیٰ بھی دینے کو تیار نہیں۔ کیونکہ رب کو تنہائی پسند ہے وہ زمین و آسمانوں کے درمیان اپنی ربوبیت کی بنائی کرسی پر تن تنہا براجمان ہے وہ ازل سے تھا اور ابد تک رہے گا۔
مگر عقل ہم انسانوں کو ہمیشہ شرک کا مشورہ دیتی ہے اور مختلف سوالات میں الجھائے رکھتی ہے جب کہ عشق کا کہنا ہے کہ کبھی کوئی سوال مت اُٹھاؤ کیونکہ یہ شرک میں آتا ہے اور اللہ کو اپنے ساتھ کوئی شریک پسند نہیں۔ اس پر اگر ہم زیادہ غور کرتے چلیں جائیں تو شیطانی خیالات جو کہ عقل کے ماتحت ہوتے ہیں وہ انسان کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں اور پھر انسان سے دانستہ نادانستہ طور پر ایسے گناہ یا عمل سرزد ہو جاتے ہیں جو کہ انسان کو شرک کی طرف لے جاتے ہیں اور جن کی وجہ سے انسان گناہ گار اور سزا وار ٹھہرایا جاتا ہے۔
اس لئے میری گزارش ہے کہ جب بھی اللہ کی نعمتوں کا ذکر ہو فکر ہو تو اپنی عقل کے گھوڑے کی لگام اپنے ہاتھوں میں کھینچ کر رکھیں اور اپنے عشق کے مسافر کو اپنے اللہ کے قریب ہونے کا زیادہ سے زیادہ موقع دیں۔ اپنے عشق میں پاکیزگی پیدا کریں، عشق میں کسی طرح کی بھی کوئی ملاوٹ مت شامل کریں کیونکہ اگر آپ نے اپنے عشق میں ملاوٹ پیدا کر لی تو پھر آپ شرک کرنے والوں میں سے ہو جائیں گے اور پھر آپ کے لئے توبہ کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں گے۔
ہم انسان بھلے کسی بھی ملک، قوم اور مذہب سے تعلق رکھتے ہوں ہم پر لازم ہے کہ اپنے خالقِ حقیقی کو احد مانیں، صمد مانیں، یکتا مانیں، اکیلا مانیں، تنہا مانیں اور اُس کے ساتھ کوئی اور شریک مت ٹھہرائیں۔

کوئی لوٹا دے میرے بیتے ہوئے دن

آج میں حال میں کھڑے ہو کر ماضی کی طرف جھانکتا ہوں تو یادوں کے جھرونکوں میں مجھے بے شمار خوبصورت دن یاد آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ ہم گاؤں میں ہوا کرتے تھے جب فجر کی اذان ہونے کا وقت ہوتا تھا تو محلے کی مسجد کے مولوی صاحب ہمیں مسجد کے سپیکرز سے نام لے لے کر بلایا کرتے۔ گل بادشاہ اُٹھو، فجر کی نماز کا وقت ہو گیا ہے، امین، اُٹھو سپارہ پڑھنے کا وقت ہو گیا ہے، شاہد جلدی کرو دیر ہو جائے گی۔ والدین ہمیں جھنجھوڑتے اور زبردستی گرمی سردی مسجد میں نماز پڑھنے اور اُس کے بعد سپارہ پڑھنے کیلئے بھیج دیتے جبکہ ہمارا بالکل دل نہیں ہوتا تھا کہ ایسا کریں مگر چارو ناچار ہمیں جانا پڑتا تھا۔

جب سپارہ پڑھ کر آتے تو ماں نے ہمارے لئے چائے اور پراٹھا بنا کر رکھا ہوتا تھا ہم ناشتہ کرتے پھر بستہ اُٹھانا، ہاتھ میں تختی لینی اور گلی محلوں کے دوستوں کے ساتھ سکول چلے جانا وہاں جا کر ہم ''لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنا میری'' پڑھا کرتے پھر پاکستان کا قومی ترانہ یاد کروایا جاتا اور پھر ہم اپنی اپنی کلاسوں میں چلے جایا کرتے۔ کلاسیں بھی کیا تھیں ٹاٹ بچھے ہوتے تھے کلاسوں میں اور ہم ٹاٹ پر بیٹھ کر پڑھا کرتے۔ چھٹی میں ہمیں انگریزی کا مضمون شروع کرایا جاتا اُس سے پہلے پانچویں تک ہم انگریزی نہیں پڑھا کرتے تھے یا ہمیں نہیں پڑھایا جاتا تھا۔ املاء کیلئے تختی لکھی جایا کرتی تھی، ایک خاص قسم کی قلم جو کانے سے بنائی جاتی تھی اُس مین کٹ بھی لگایا جاتا تا کہ املاء خوبصورت طریقے سے لکھی جاسکے۔ ایک دفعہ آدھی چھٹی ہوتی تھی کچھ بچے کلاس میں رہتے تھے کچھ اپنے گھروں میں جا کر روٹی کھایا کرتے تھے۔ کچھ بچے دور کے گاؤں سے آیا کرتے تھے تو وہ اپنی روٹی ساتھ لے آیا کرتے تھے جس میں روٹی کیساتھ گڑ ہوتا کبھی اچار تو کبھی مولی کا پراٹھا۔

چھٹی ہونے سے پہلے ہم پہاڑے پڑھا کرتے تھے شاید آج کے بچوں کو پہاڑوں کا مطلب نہ آئے پہاڑے یعنی ٹیبلز، دو اکم دو، دو دونی چار، دو بچے کھڑے ہو جایا کرتے جو پہلے زور زور سے

وہ پڑھا کرتے باقی کلاس اُن کے پیچھے پہاڑے دُہرایا کرتی پھر پہاڑے دس تک پورے ہو جایا کرتے تو چھٹی کی گھنٹی بج جایا کرتی اور ہم سب دوست یار بھاگتے ہوئے اپنے گھروں کی طرف نکل پڑتے۔ سکول جانا بھی ایک عذاب لگتا تھا پڑھائی پابندی کے ساتھ پڑھنا بہت مشکل اور دشوار کام لگتا مگر کچی پکی سے لے کر میٹرک تک ہم لوگ یہی کیا کرتے تھے۔

بچپن کے کھیلوں میں مجھے اچھی طرح سے یاد ہے گلی ڈنڈا، لٹو، باندر کلا، بنٹے، سگرٹوں کی خالی ڈبیاں جمع کرنا یہ ہمارے بچپن کے کھیل ہوا کرتے تھے۔ بہت زیادہ ایڈوانس کھیل کھیلنا تو وہ والی بال تھا شام کو کنویں پر چلے جانا دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر گپے لگانا اور گاؤں کے مقامی لوک فنکاروں سے کبھی ہیر سننا کبھی سیف الملوک اور کبھی تاش کھیلنا یہ ہمارے محبوب مشاغل تھے۔ شام کو سورج کا غروب ہونا اور چکی کی کو کو کی آواز سے دل کے اندر عجیب سی اُداسی پیدا ہو جانی یہ ہمارے روز مرہ کے کاموں میں سے تھے۔ مغرب کے وقت ہر قسم کے کھیل ختم کر کے ہم لوگ اپنے گھروں کو واپس آجایا کرتے۔ اُس دور میں ہینڈ پمپ تھے یا پھر ہم لوگ سوئے پر چلے جاتے گرمیوں کے دنوں میں نہانے کیلئے، آپ سوچیں گے! کہ یہ سُوا کیا ہوتا ہے میں آپ کو بتاتا چلوں کہ سُوا نہر سے نکلا ہوا پانی کا حصہ ہوتا ہے جس کے ذریعے گاؤں کی زمینوں کو پانی ملتا ہے وہاں پر ہم لوگ خاص طور پر گرمیوں کی چھٹیوں میں گرمی سے بچنے کیلئے نہانے چلے جایا کرتے تھے ساتھ میں اپنے دوستوں کی زمینوں میں لگے تربوز اُٹھا کر لے جاتے۔ اُن تربوزوں کو سُوے کے پانی میں ٹھنڈا ہونے کیلئے رکھ دیتے جب وہ ٹھنڈے ہو جاتے تو پھر ہم کسی چھری سے نہیں کاٹتے تھے بلکہ اپنے ہاتھ کے مکے سے اُسے توڑتے پھر جب وہ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا تو سارے دوست بیٹھ کر تربوز کھانے لگ پڑتے۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ آج آپ کو میں کس طرف لے آیا مگر آج مجھے اپنا بچپن، اپنا گاؤں، اپنے گاؤں کے دوست احباب، میرے گاؤں کی چکی، اُس کی کو کو کی آواز، سورج ڈوبنے کا منظر، فجر کی اذان اور مولوی صاحب کا مسجد سے سپیکر سے ہمیں آوازیں دینا سب یاد آرہا ہے۔

ڈسپوزبل

زندگی کی رفتار کس قدر تیز ہوگئی ہے کبھی آپ نے اس پر غور کیا؟ ہم لوگ ہر چیز تیزی سے کرنا چاہتے ہیں، جلدی میں کرنا چاہتے ہیں اپنی باری کا انتظار کرنے کو تیار نہیں، قطار میں کھڑے ہونے کیلئے تیار نہیں، ہر کام شارٹ کٹ میں کرنا چاہتے ہیں بھلے وہ پڑھائی ہو، نوکری حاصل کرنا ہو، یوٹیلیٹی بلز ادا کرنا ہوں، ہسپتالوں میں بیماریوں کا علاج کرانا ہو۔ غرضیکہ کوئی بھی ایسا عمل ہم فطری انداز میں کرنے کو تیار نہیں ہر کام غیر فطری طریقے سے کرنا چاہتے ہیں جس کا اصل مقصد یہ ہے کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کر سکیں۔

موجودہ دور میں پوری دنیا اس دوڑ میں لگی ہے خاص طور پر مغربی ممالک، امریکہ اور پھر ترقی پذیر ممالک میں آجائیں تو ہم جیسے ترقی پذیر ملکوں کے لوگ بھی انہی کوششوں میں ہیں کہ جلد از جلد جو بھی عمل کریں اُس کا نتیجہ ہمیں فوری طور پر مل جائے انتظار نہ کرنا پڑے بٹن کلک کریں اور جواب حاضر ہو جائے ہمارے سب کام جادو کی طرح ہو جائیں کوئی محنت مشقت نہ کرنی پڑے۔ کسانوں کی خواہش ہے کہ زمین میں بیج ڈالیں اور چند دنوں میں فصلیں تیار ہو جائیں بھلے وہ گندم ہو، چاول ہو، گنا ہو، کوئی بھی فصل ہو دنیا کے تمام سائنسدان ایسے کاموں پر ریسرچ کر رہے ہیں اور مغربی ممالک اربوں ڈالرز ریسرچ پر خرچ کرتے ہیں نئے نئے طریقے ایجاد کرتے ہیں دنیا میں لوگوں کو آسانیاں پہنچانے کیلئے لوگوں کیلئے زندگی کو آسان بنانے کیلئے۔ مگر میں آپ لوگوں سے ایک بات شیئر کرنا چاہتا ہوں رب تعالیٰ نے جو طریقۂ کار کائنات میں دیا ہے اُس میں ایک تسلسل ہے ٹھہراؤ ہے اُس میں آپ کو اپنے حصے کا انتظار کرنا پڑے گا۔

آپ نے جو کام بھی کرنا ہے اُس میں وقت لگے گا، جب انسان کی پیدائش کا وقت ہوتا ہے اُس

کیلئے رب تعالیٰ نے ایک مقررہ ٹائم 36 ہفتے یا 9 ماہ کا وقت رکھا ہے اسی طرح سے جب ہم فصلیں اُگانے پر آتے ہیں اُس پر بھی رب نے موسموں کا انحصار رکھا ہے۔ گرمیوں کے موسم میں گرمیوں کی فصلوں کا وقت ہوتا ہے اور وہاں تین چار ماہ لگ جاتے ہیں اسی طرح سردیوں کے موسم میں فصلیں لگانے اور مکمل ہونے میں تین چار ماہ لگ جاتے ہیں غرضیکہ پورے سال میں انسان کو شیڈول کے تحت ہر کام کرنا پڑتا ہے اور یہ طریقہ کار ربِ تعالیٰ نے ازل سے بنایا ہے جس میں انسان کی مرضی کا کوئی دخل نہیں اِس پر عمل کرنا ہے۔

انسان کو دس بارہ پندرہ برس تعلیم حاصل کرنے میں لگ جاتے ہیں پھر اُس کے بعد وہ عملی زندگی کے دور میں شامل ہو جاتا ہے جہاں تک میری سوچ اور فہم کا تعلق ہے میرے نزدیک یہی ہے کہ ہر کام کیلئے اپنے حصے کی خواری کاٹنا، مشقت کرنا ضروری ہے۔ اگر زندگی میں انسان نے کچھ حاصل کرنا ہے مثبت طریقے سے، مثبت حوالے سے، مثبت سوچ سے، کیونکہ خیر کے راستے میں ہمیشہ وقت درکار ہوتا ہے اور اُس کا تسلسل بہت آہستہ طریقے سے چلتا ہے جبکہ شر کے کام جتنے ہوتے ہیں اُن میں جلد بازی ہوتی ہے بے چینی ہوتی ہے اور رب تعالیٰ نے بھی بارہا ہمیں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ ہم کوئی کام بھی جلد بازی میں نہ کریں کیونکہ جلد بازی شر کا حصہ ہے اور یہ نقصان دہ ہے جبکہ خیر کا راستہ جس میں دیر لگ سکتی ہے آپ کو کوئی بھی مقصد حاصل کرنے میں اور جدوجہد کرنے میں مگر آخر میں آسانیاں ملیں گی سکونِ قلب ملے گا پُرمسرت کامیاب زندگی گزارنے کے آپ اہل ہو جائیں گے۔ اور اگر آپ نے جلد بازی کی جیسے کہ آج کے دور میں ہر چیز ڈسپوزبل بنا دی گئی ہے برتن ڈسپوزبل بنا دیئے گئے، کھانا کھایا اور برتنوں کو پھینک دیا، موبائل ڈسپوزبل آ گئے، بچوں کے گیمز ڈسپوزبل آ گئے۔ بے شمار ایسی چیزیں ہے جو کہ ڈسپوزبل میں کنورٹ کر دی گئی ہیں جو کہ شر کی علامت ہے اِن میں خیر نہیں ہم نے خیر کی طرف جانا ہے اور یہ ہمارے لئے بہت ضروری ہے۔ یہ ہمارے لئے لمحہ فکریہ ہے اس میں ہمیں غور کرنا ہے۔ یہی آپ کے ساتھ بات کرنی تھی کہ زندگی کو ڈسپوزبل مت بنائیں کیونکہ زندگی ڈسپوزبل نہیں ہے۔

زندگی کیسی ہے پہیلی؟

جس طرح دنیا میں پانی 70 فی صد ہے اور خشکی تقریباً 30 فی صد کے لگ بھگ ہے اسی طرح انسانی بدن میں جو پانی کی مقدار ہے وہ بھی 70 فی صد پانی اور 30 فی صد باقی اجزائے زندگی ہیں جن سے انسانی بدن کی نشوونما ہوتی ہے۔ اسی چیز کو ہم اپنی روزمرہ زندگی کے رہنے سہنے رشتہ داریاں دوستیاں اور گلے شکوؤں کے تناظر میں دیکھیں تو انسانی زندگی کے جو رویئے ہمیں ملتے ہیں اور جن رویوں کے ساتھ ہم زندگی بسر کرتے ہیں اُن میں بھی اکثریت ان لمحات کی ہے جن میں خوشیاں بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں۔ اُن کو ہمارے اپنوں میں سے کوئی نہ کوئی خراب کر دیتا ہے اور وہ خوشی بھی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔ کبھی آپ نے سوچا ایسے کیوں ہوتا ہے کہ زندگی میں غم دبے پاؤں چپکے سے آ جاتے ہیں اور بے تحاشا آتے ہیں جبکہ خوشیاں اور مسرت کے لمحات انسان کو تراشنے پڑتے ہیں محنت کرنا پڑتی ہے پھر جا کر بہت تھوڑے وقت کے لئے چند خوشی کے لمحات میسر آتے ہیں وگرنہ وہی جیسے کہ دنیا میں پانی 70 فی صد ہے۔ جس طرح کے انسان کے بدن میں پانی 70 فی صد ہے۔ اسی طرح میں سمجھتا ہوں کہ عام آدمی کی زندگی میں غم بھی شاید 70 فی صد سے زیادہ ہوتے ہیں اور خوشیاں 20، 25 یا بہت زیادہ ہوں تو شاید 30 فی صد تک۔ خوشی کے لمحات زیادہ دیرپا نہیں ہوتے ہوا کے جھونکے کے مانند ہوتے ہیں جنہیں آپ محسوس کر سکتے ہیں، بہار کے اُن پھولوں کی مانند ہوتے ہیں جو خزاں کے بعد اور شدید گرمی سے پہلے بہت تھوڑے وقفے کیلئے باغات میں کھلتے ہیں پھر زندگی کی سخت دھوپ میں کملا جاتے ہیں۔ پھر انسان آنیوالے اگلے موسم کی طرح نئے پھولوں کی آمد اور بہار کا منتظر ہو جاتا ہے اور اسی خوشی کی آس میں اپنے تمام غم جو کہ اُسے پھولوں کے ساتھ کانٹوں کی طرح ملتے ہیں اور گو پھول تو مرجھا کر ختم ہو جاتے ہیں مگر کانٹے غموں کی طرح کبھی نہیں مرجھاتے بلکہ انسانی دل اور روح میں مسلسل چبھن کی طرح محسوس ہوتے رہتے ہیں۔

انسان زندگی کے دھوکے میں اس گمان میں رہتا ہے کہ چلو کوئی بات نہیں ابھی زندگی پڑی ہے آگے بہت سے خوشی کے لمحات آئیں گے اور میں زندگی جیوں گا ایک لمبی پُر آسائش زندگی۔ انسان ٹکڑوں میں زندگی بسر کرتا ہے بالکل ایسے ہی جیسے ایک چھوٹا بچہ جس کو ماں باپ یہ کہتے ہیں کہ بیٹا اگر تم کو بڑا آدمی بننا ہے تو اُس کیلئے پہلے سکول جانا پڑے گا، کالج جانا پڑے گا، یونیورسٹی میں پڑھنا پڑیگا، زندگی کو آسان اور خوشگوار بنانے کیلئے تمھیں کچھ مشکلات برداشت کرنا پڑیں گی، ۔اور وہ بچہ ساری عمر اپنے ماں باپ کے بتائے راستے پر چلنے کی کوشش کرتا ہے اُس سے پہلے اُس کے والدین بھی اسی کوشش میں اپنی پوری عمر گنوا چکے ہوتے ہیں مگر زندگی ایک ایسی پہیلی ہے جو کہ آج تک کسی کی سمجھ میں نہیں آسکی یہ ایک ایسا معمہ ہے جسے ہر عورت اور مرد حل کرنے کی جستجو میں لگا ہے مگر آج تک کوئی بھی سراغ نہیں پا سکا اور شاید کوئی اس کا سراغ بھی نہ مل سکے۔

یہ زندگی ایسا خوبصورت دھوکہ، فریب یا تماشا ہے کہ ہر انسان یہ سمجھتا ہے کہ میں زندگی پر حاوی ہو جاؤں گا اس کے اسرار و رموز سمجھ سکتا ہوں سمجھ جاؤں گا مگر ایسا نہیں ہوتا اس زندگی کی کوئی معیاد نہیں کبھی یہ پیدا ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہے کبھی پیدا ہوتے ہی ختم ہو جاتی ہے کبھی 70، 80 یا 90 برس تک چلتی ہے مگر پھر بھی انسانی مٹی کے پتلے میں تگ و دو جاری رہتی ہے کہ میں نہیں ہاروں گا میں نے زندگی کو مستقل اپنے لئے خوشیوں میں تبدیل کرنا ہے اور اِن خوشیوں کے فریب میں آکر وہ بے شمار غم سمیٹ لیتا ہے مگر خود غافل رہتا ہے اور یہ سلسلہ جس کا کہ کوئی سرا آج تک نہیں پکڑا جا سکا کہ زندگی کی پہیلی کو کون کس طرح سے سلجھائے گا غم کم کیے جائیں گے خوشیاں زیادہ میسر آئیں گی؟

آپ لوگ ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ میں کوئی زندگی سے مایوسی کی باتیں کر رہا ہوں باخدا ہرگز ایسا نہیں ہے مگر میں کیا کروں کہ آج تک جتنی زندگی برتی ہے، نبھائی ہے، گزاری ہے، جو ذاتی تجربہ ہے میں اُس کی روشنی میں آپ سب پڑھنے والوں کو بتا رہا ہوں کہ زندگی میں غم مسلسل رہتے ہیں اور خوشیاں بہت کم گنی چنی تھوڑی دیر کیلئے، جن کو پانے کیلئے انسان اپنا آپ داؤ پر لگا دیتا ہے یہ وہ پہیلی ہے جو آج تک سلجھائی نہیں گئی اور شاید نہ ہی کبھی سلجھائی جا سکے گی۔

غیرت

ہم جس معاشرے میں زندگی گزار رہے ہیں اس میں خواتین کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی کسی بھی لیول پر کسی بھی عمر میں کسی بھی صورت میں ۔ آپ کے ساتھ ایک واقعہ شیئر کرنے جارہا ہوں کہ میرے قریبی دوست کا بیٹا جو کہ ابھی سیکنڈ ائیر بھی مکمل نہیں کر سکا، اُس کی بہن یونیورسٹی میں پڑھ رہی ہے، ہمارے دین نے حکم ہے کہ بیٹیوں کے بارے میں خاص طور پر اُن کی ازدواجی زندگی کے بارے میں فیصلہ کرنے لگو تو پہلے اُن کی رائے پوچھ لیا کرو۔ آج سے چند برس پہلے تک والدین جب بیٹیوں کا رشتہ کرتے تھے تو لڑکے والوں کے ہاں جا کر بات پکی کر دیتے تھے کہ ہاں ہم نے اپنی بیٹی آپ کے بیٹے کے نام لگا دی ہے آج کے بعد ہماری بیٹی آپ کی امانت ہے اور آپ جب چاہیں ہمیں تاریخ بتائیں اپنی امانت ہمارے گھر سے لے جائیے گا۔ اتنا بڑا فیصلہ ماں باپ اپنی صوابدید پر کر لیا کرتے تھے پھر جب گھر آتے تھے تو اُن کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ ہوتا تھا بڑی خوشی کے ساتھ وہ گھر میں آ کر مبارکباد دیا کرتے تھے کہ مبارک ہو ہم نے رشتہ فلاں بندے کیساتھ طے کر دیا ہے۔ جب اطلاع ملتی تو بعض بچیاں سکتے میں آ جاتی تھیں، بعض خوشی کا اظہار کرتی تھیں اور بعض بغاوت بارے سوچنے لگ جاتی تھیں کہ بناء ہماری مرضی کے فیصلہ کر دیا گیا وہ فیصلہ جو کہ پوری زندگی پر محیط ہے ایک ایسے شخص کے ساتھ جسکو سوائے اُس کے نام کے علاوہ، وہ اُس کی شخصیت کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔

بعض ایسی بچیاں بھی تھیں ہمارے گاؤں میں، ہمارے معاشرے میں جو کہ اپنی پسند کی خاطر گھروں سے بھاگ جایا کرتی تھیں ماں باپ کیلئے ساری عمر کیلئے بدنامی کا باعث بن جایا کرتی

تھیں۔ کچھ عرصہ سال دو سال تک ماں باپ بھی تعلق توڑ لیتے تھے پھر چند برس کے بعد خاندان کے لوگ اور بزرگ بیچ میں پڑ جاتے اور رشتے دوبارہ بحال ہو جایا کرتے۔ مگر اہل محلہ اور دنیا والے اُس بچی کو ہمیشہ بُری نظر سے دیکھتے۔ ایسی لڑکی جب کبھی گھر سے باہر نکلتی تو لوگ اُسے دیکھ کر سرگوشیاں کرتے کہ یہی وہ شمع ہے گھر سے طیفے کے ساتھ بھاگ گئی تھی اب دو بچوں کی ماں بن گئی ہے۔ جب تک وہ لڑکی زندہ رہتی اُس کے ساتھ یہ قصہ یہ الزام چلتا رہتا کیونکہ اُس نے شادی والدین کی اجازت کے بغیر کی۔ معاشرے میں ایسی لڑکیاں بھی ہیں جو ماں باپ کی عزت کی خاطر بناء کچھ کہے اپنے ارمانوں کا خون کر کے چپ ہو جاتی ہیں اپنی زندگی قربان کر دیتی ہیں۔ یہی عمل معاشرے میں ابھی تک چل رہا ہے۔ اندرون سندھ میں گھر سے بھاگنے والی لڑکی کو کاروکاری کر دیتے ہیں بھائیوں پر یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی بہن کو تلاش کریں اور اُس کو غیر آباد علاقے میں لے جا کر قتل کر کے پھینک آئیں یہ اُن کی غیرت کا ایک ثبوت ہے جو کہ میں سمجھتا ہوں بزدلانہ حرکت ہے۔ یہی عمل خیبر پختونخوا میں ہوتا ہے کہ اگر وہاں بچیاں خاندان کی مرضی پر شادی کرنے سے انکار کر دیں تو انہیں گولیوں کا نشانہ بنا دیا جاتا ہے۔ یہی پنجاب میں بھی ہوتا ہے اور بلوچستان کا تو پوچھیں ہی نہ کہ کیا حالات ہوں گے۔

یہ سب بیان کرنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ آج کے دور میں اسلام آباد میں رہتے ہوئے میرے ایک دوست نے اپنے کزن کی بیٹی کا رشتہ مانگا اپنے بیٹے کی مرضی کے مطابق اور بیٹی سے بھی اجازت لی گئی اُس کے والدین کو بھی پتا تھا کہ ہمارے بچی راضی ہے۔ لڑکی لڑکا اپنی زندگی اپنی خوشی سے بسر کرنا چاہتے ہیں اس پر دونوں خاندانوں کو کوئی اعتراض بھی نہیں تھا مگر اچانک اُس گھر میں سے اُس بیٹی کا بڑا بھائی جو کہ سیکنڈ ائیر بھی پاس نہیں کر سکا باپ کے پیسے پر عیاشی کرتا ہے راتوں کو جاگتا ہے، سارا دن سوتا ہے اور صبح اُٹھ کر ماں سے 2,3 ہزار روپے مانگتا ہے جیب خرچ کیلئے اور ماں اُسے روتے ہوئے گالیاں دیتے ہوئے بد دعائیں دیتے ہوئے پیسے دینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ ماں شوگر کی مریضہ ہے ہائی بلڈ پریشر ہے کبھی کبھی کومے میں چلی جاتی ہے مگر بیٹے کو احساس نہیں ہوتا جب اُسے یہ پتا چلا کہ بہن کی شادی اُس لڑکے کیساتھ طے پا رہی ہے جو اس کے بچپن کا

دوست بھی ہے تو اُس نے شادی کی مخالفت شروع کر دی۔

اچانک ماحول میں تبدیلی آئی اور صورتحال نے کروٹ لی جس میں ایک طرف دونوں خاندان اکٹھے تھے اور دوسری طرف ایک ذہنی طور پر مریض، ضدی اور ہٹ دھرم انسان جس نے اس رشتے کو انا کا مسئلہ بنانے اور پورے معاملے کو خراب کرنے کی کوشش کی۔ اُس نے بہانہ بنایا کہ کیونکہ لڑکا میرا دوست ہے میں دوست کو اپنی بہن کا رشتہ نہیں دے سکتا کہ اس سے میری دوستی متاثر ہوتی ہے اور اس سلسلے میں وہ اس حد تک چلا گیا کہ وہ اُس نے اپنے دوست پر قاتلانہ حملہ کرنے کی بھی کوشش کی مگر اللہ کے فضل و کرم سے وہ بچ گیا۔ پھر دونوں خاندانوں نے بیٹھ کر طے کیا کہ رشتہ ہوگا کیونکہ دونوں بچوں کی مرضی ہے اور یہ رشتہ اللہ اور اللہ کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے مطابق اُن سے پوچھ کر طے کیا جا رہا ہے۔

یہ بات میں آپ کو پنجاب کے بڑے شہر میں رہنے والوں کی بتا رہا ہوں، دیکھیں سوچ کتنی محدود ہے حالانکہ ہم لوگ خود کو پڑھا لکھا ترقی یافتہ دین سے منسلک تصور کرتے ہیں۔ خود تو ہم دوسروں کی ماں بیٹیوں کو غلط نگاہ سے دیکھتے ہیں اور دوسری طرف ہم ایک شرعی کام کیلئے غیرت کو لے آتے ہیں۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ ہم کس طرف جا رہے ہیں ہمارے ہاں ڈبل سٹینڈرز کیوں ہیں؟ اللہ پاک ہمیں ایسی منافقت اور ایسی بے راہ روی سے بچائے اور ایسی غیرت کے نام پر جو بھائی اور رشتہ دار ٹھیکیدار بنتے ہیں اُن کو اللہ پاک سیدھے راستے پر لائے اور ہمیں زندگی گزارنے کا سلیقہ عطا فرمائے تا کہ بچیاں باعزت طریقے سے اپنے گھروں میں آباد ہو سکیں۔ آمین

بچے ہمارے دور کے

آج ہر میدان میں اور ہر مضمون میں ترقی اور ریسرچ کا کام ہو رہا ہے دنیا دن بدن مادی طور پر ترقی یافتہ ہوتی جا رہی ہے۔ ماضی میں جھانکا جائے تو خاص طور پر اپنے ملک کے حوالے سے دیکھیں اور غور کریں تو پتا چلے گا کہ ہمارے ملک میں پچاس برس پہلے یا اُس سے بھی دس سال پیچھے سکول، کالجز، یونیورسٹیاں اور پروفیشنل کالجز بہت کم تھے مگر اُس دور کے بچے کم تعلیمی سہولیات ہونے کے باوجود ہر میدان میں کامیاب اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوا کرتے تھے اکثریت اُن میں سے غریب خاندان کے بچوں کے ہوا کرتی تھی جن کے والدین یا تو کھیتی باڑی کیا کرتے تھے یا ہاتھ سے کھیس بُنا کرتے تھے یا پھر کوئی ترکھان ہوا کرتا تھا۔ کسی کا باپ دھوبی تھا کسی کا والد درزی تھا اور کوئی امام مسجد کا بیٹا ہوا کرتا تھا مگر اُن میں آگے بڑھنے کی تگ و دو اور خواہش ہوا کرتی تھی۔ پہلی سے لے کر میٹرک تک یہ سب دوست بچے اکٹھے پڑھا کرتے تھے ایک نصاب ہوا کرتا تھا آٹھ مضمون ہوا کرتے تھے اور دسویں میں بورڈ کا امتحان ہوا کرتا تھا۔ اِس امتحان میں اگر کسی ایک مضمون میں بھی بچہ رہ جاتا تو پورے میٹرک میں فیل ہو جاتا اُسے پھر دوبارہ تمام مضامین کے امتحان دینا پڑتے۔ اس لئے وہ بہت زیادہ چوکس رہتا اور اساتذہ بھی اُن پر بہت زیادہ محنت کیا کرتے تھے تا کہ طالبعلم میٹرک میں کم از کم فیل نہ ہوں۔

پھر آہستہ آہستہ معاشرے کی اقدار بدلنا شروع ہوئیں ظاہری ترقی نے باطنی ترقی کو پیچھے چھوڑ دیا

کلاس رومز میں ٹاٹ کی جگہ ڈیسکوں کرسیوں نے لے لی۔ بھدے اور بوڑھے اساتذہ جن کے ہاتھ بھاری بھر کم ہوا کرتے تھے اُن کی جگہ پینٹ کوٹ والے دبلے پتلے استاد نے لے لی جو کہ استاد کم اور دوست زیادہ خود کو ظاہر کرتا ہے۔ لوگوں نے سرکاری سکولوں میں اپنے بچوں کو داخل کروانا کم کر دیا صرف ان لوگوں کے بچے رہ گئے جن کی مالی استطاعت نہیں تھی کہ وہ اپنے بچوں کو پرائیویٹ انگلش میڈیم سکولوں میں ڈالیں جن کی فیسیں بہت زیادہ ہوا کرتی تھیں اور ہیں۔ ایسی صورتحال میں ملک میں چاروں صوبوں میں تعلیم کا معیار بڑھنے کی بجائے تنزلی کی طرف جانا شروع ہو گیا خاص طور پر صوبہ سندھ اور کے پی کے میں، بلوچستان میں پرائمری تک کی تعلیم اُن کی مادری زبانوں میں دی جاتی تھی اور دی جاتی ہے مگر واحد صوبہ پنجاب تھا اور ہے کہ جس میں ابھی تک بچوں کو تعلیم اُن کی مادری زبان پنجابی میں نہیں دی جاتی اور نہ ہی آج تک کوئی ایسا طریقہ کار رائج کیا جا سکا ہے کہ جس کے تحت پنجابی کے حروف تہجی بنائے جائیں اور اُن کے مطابق پنجابی زبان کو کم از کم پرائمری تک تمام سکولوں میں پڑھایا جائے۔

یہ تو ذیلی بات آ گئی اصل بات جس کی طرف میں آپ کو لے جانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ تعلیمی نظام میں سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ ہم لوگ احساس کمتری کا شکار ہو چکے ہیں کیونکہ جہاں کہیں بھی جو بھی شخص تھوڑی غیر ملکی زبان پر قدرت رکھتا ہے بھلے انگریزی ہو عربی ہو یا کوئی بھی دوسری زبان ہو ہم لوگ اُس سے مرعوب ہو جاتے ہیں اور جو بھی شخص یا طالب علم آج کے موجودہ دور میں اس معیار پر پورا نہیں اترتا اُس کو زندگی کے ہر میدان میں احساس محرومی کا شکار ہونا پڑتا ہے۔

میں آج تک جتنا بھی اپنے معاشرے کے بارے میں غور کروں اور جو میں نے عملی زندگی میں سیکھا ہے وہ یہ ہے کہ جن کے والدین ان پڑھ اور کم پڑھے لکھے ہوا کرتے تھے اُن کے بچوں میں تعلیم حاصل کرنے کا شعور ان والدین کے مقابلے میں جو کہ انتہائی تعلیم یافتہ ڈاکٹرز، انجینئرز، وکلاء اور اسی طرح ہر شعبے میں جو نمایاں حیثیت میں کام کر رہے ہیں اُن کے بچوں میں حصول علم کی وہ خواہش اور شدت موجود نہیں رہی بلکہ کم سے کم ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ جو میرے جیسے کم عقل انسان کے مطابق یہ ہے کہ آج کے دور کے والدین نے اپنے بچوں کو زندگی کی وہ تمام

بنیادی سہولتیں بہم پہنچادی ہیں جو کہ ماضی میں نہیں ہوا کرتی تھیں جس کی وجہ سے بچوں میں وہ جستجو وہ شوق نہیں رہا کہ ہم نے تگ و دو کر کے کچھ حاصل کرنا ہے، خود کو معاشرے میں باعزت مقام پر لے کر جانا ہے۔

پرائیویٹ تعلیم کی بہت زیادہ مارکیٹنگ نے گو ملک میں تعلیمی اعداد و شمار میں اضافہ کیا ہے مگر اخلاقی طور پر ہم لوگ اور موجودہ نسل اخلاقی طور پر گراوٹ کا شکار ہوگئی ہے اور مزید ہوتی جارہی ہے۔

موجودہ تعلیمی نظام میں بنیادی تبدیلیاں نہ لائی گئیں اور حکومت وقت نے پورے ملک میں اگر ایک نصاب رائج نہ کیا تو احساس محرومی اور احساس کمتری میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ ہمارے بہترین ذہن جو کہ نوجوان نسل کی صورت میں موجود ہیں وہ ملکی ترقی میں کوئی بڑا کردار ادا نہیں کرسکیں گے۔

اس لئے ہمیں چاہیے کہ اپنے تعلیمی نظام کو بہتر بنائیں، گھروں میں اخلاقیات کا درس دیں، اپنے بچوں میں ایک دوسرے کیلئے پیار محبت اُجاگر کرنے میں مددگار ثابت ہوں تاکہ آنے والی نسلیں ملکی ترقی کی ضامن بنیں اور ہمارے معاشرے سے کرپشن بے ایمانی، جھوٹ، ناپ تول میں کمی اور ناانصافی کا خاتمہ ہوسکے عدل و انصاف اور مساوات قائم ہوسکیں۔

صبر

آج بات کرنی ہے صبر پر اور صبر کے معنی برداشت کرنا نرم دلی، نفس کو روکنا، کسی صدمے یا حادثے پر خاموشی اختیار کرنا، کسی مظلوم کی تکلیف کا اثر جو ظالم پر پڑے ہے۔ صبر کے مترادفات اطمینان، برداشت، تحمل، تسلی، توقف حلم اور ضبط ہیں۔ سورہ بقرہ میں آیات نمبر 152 سے 157 تک رب تعالیٰ فرماتا ہے اے ایمان والو مدد لو صبر سے اور نماز سے بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے دیکھو نہ کہو ان کو جو راہ خدا میں قتل کیے جائیں مردہ نہیں وہ زندہ ہیں پر تم اس حقیقت کو جانتے نہیں اور دیکھو ہم آزما کے رہیں گے تم کو کسی قدر خوف وخطر اور بھوک سے اور مال وجان اور پیداوار کے نقصانات سے اور خوشخبری دو اے نبی اُن کو جو صبر کر کے دکھائیں یعنی وہ کہ جب بھی پہنچے اُن کو کوئی مصیبت اور نقصان تو کہیں ہماری جان و مال اللہ ہی کیلئے ہے اور ہم اُسی کی طرف لوٹ جانے والے ہیں خوشخبری دو اُن کو کہ یہ وہ لوگ ہیں جن پر عنایتیں ہوں گی اُن کے رب کی اور رحمت کی اور یہی ہیں جو کہ کامیاب ہیں۔

اب آپ دیکھیں اور سوچیں کہ صبر کے بارے میں رب تعالیٰ نے ہم لوگوں پر کس قدر زور دے کر کہا ہے کہ حالات کیسے ہی مشکل کیوں نہ ہوں ہر انسان کو اپنے نفس پر قابو رکھنا پڑے گا، اپنے غصے کو قابو میں رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرنی پڑی گی کیونکہ غصہ شیطانی عمل ہے جو کہ شر کی طرف سے انسانی دماغ میں پیدا کیا جاتا ہے اور اس غصے کی وجہ سے بے شمار جھگڑے، لڑائیاں قتل وغارت گری اور بے شمار جانی و مالی نقصانات انسانی معاشرے کو اُٹھانا پڑتے ہیں۔

یہ جو باتیں میں آج آپ سے شیئر کر رہا ہوں اس کے پیچھے پوری داستان ہے اور وہ کچھ یوں ہے کہ آج جب میں اپنے کام کے سلسلے میں گھر سے باہر نکلا تو میری گاڑی کے پیچھے ایک اور گاڑی آرہی تھی اُس کا ڈرائیور مجھے بار بار ڈپر مار رہا تھا ہارن دے رہا تھا کہ تم اپنی گاڑی سائیڈ پر کرو میں نے آگے جانا ہے، ایک لمحے کیلئے میرے اندر شیطانی وسوسوں نے حملہ کیا اور میرے اندر غصے کی

ایک لہر اُٹھی میں نے اپنے گاڑی کے شیشے سے اُسے اشارہ کیا کہ تمہیں کیا تکلیف ہے اور پھر اچانک مجھے ایسا کرنے پر شرمندگی ہوئی کیونکہ میرے ذہن میں ایک دم یہ خیال آگیا کہ کہیں میں نے بدتمیزی کر دی ہے۔ اگر وہ شخص غصے کا اظہار کر رہا ہے تو کم از کم مجھے ایسی حرکت نہیں کرنی چاہیے۔ میں نے فوراً اپنی گاڑی کا اشارہ لگایا اور اپنے پیچھے آنے والے ڈرائیور کو راستہ دیدیا وہ راستہ لیتے ہوئے میرے ڈرائیونگ سائیڈ کے قریب آکر بڑے غصے سے دیکھتا ہوا زناٹے سے گاڑی لے کر نکل گیا۔ میں اُس کی اس حرکت پر مسکرا کر رہ گیا اور سوچ میں پڑ گیا کہ انسان کیسے لمحہ بالمحہ اپنے رویوں میں تبدیلی پیدا کرتا ہے کہ ابھی کچھ دیر پہلے میں اپنے گھر سے بڑے آرام سے سکون کے ساتھ نکلا ہوں اور مجھے کوئی ذہنی طور پر الجھن پریشانی نہیں تھی میں اپنے راستے پر مگن اپنی شاعری کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اچانک اس گاڑی والے نے آکر میرا رویہ میرا صبر اور میرا غصہ آزمانا شروع کر دیا اور ایک لمحے کیلئے میں لال پیلا ہو گیا۔ پھر مجھے اچانک اپنے آپ پر شرمندگی ہوئی کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے، میں نے دل ہی دل میں اللہ سے معافی مانگی اور اُس بندے سے بھی جو کہ بڑے غصے میں مجھے دیکھ کر گیا تھا اور شاید اُس نے گالیاں بھی دیں ہوں گی۔

میرا آپ سب سے بڑے ہی پیار سے اور محبت سے یہ کہنا ہے کہ یہ وقت جب کبھی آپ کی زندگیوں میں آئے اور یہ اکثر آتا ہے، ایسے میں ہم نے اپنے غصے کو قابو میں رکھنا ہے صبر اور شکر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا کیونکہ صبر اور شکر کرنے سے اللہ خوش ہوتا ہے اور اُس کی مخلوق بھی۔

آئیے آج ہم سب مل کر یہ عہد کرتے ہیں کہ اپنے گھروں میں، محلوں میں، شہروں میں، اپنے صوبوں میں، اپنے ملک میں صبر اور شکر کے ساتھ ہر کام سرانجام دیں گے بھلے ہمیں کتنے ہی غصے اور ناراضی کا سامنا کرنا پڑے۔ ہمیں ہر طرف خوشیاں بانٹنی ہیں ایک دوسرے کی غلطیوں کو معاف کرنا ہے درگزر کرنا ہے اپنے اندر توازن قائم رکھنا ہے۔ آپ کو حکیمانہ مشورہ دیتا ہوں اور وہ یہ کہ اگر آپ نے اپنے آپ کو اور غصے کو قابو میں رکھنا ہے اور صبر کا ساتھ نہیں چھوڑنا تو آپ کو اپنے پاؤں گرم اور سر ٹھنڈا رکھنا پڑے گا آزمائش شرط ہے۔

پسند ناپسند

اپنے پیارے پڑھنے والوں سے گزارش کروں گا کہ میں جو بات آج کرنے جارہا ہوں اُس پر آپ غور کریں کسی حد تک آپ جب میری بات کو پڑھیں گے سوچیں گے تو آپ بھی میرے ساتھ اتفاق کریں گے۔ موضوع جیسے کہ آپ نے پڑھ لیا ہے "پسند ناپسند" جی ہاں بالکل یہی۔ اب ذرا سوچئے اپنے گھر کے بارے میں، اپنے گھر کے افراد کے ساتھ، اپنے بہن بھائیوں بچوں کے ساتھ، ماں باپ کے ساتھ، بیوی کے ساتھ کس طرح کا رویہ رکھتے ہیں؟ یقینی طور پر آپ کو بعض رشتے بہت زیادہ پسند ہوں گے بعض قدر کم پسند ہوں گے بعض بالکل ناپسند ہوں گے مگر ایک گھر میں ایک چھت کے نیچے رہتے ہوئے ہمیں اپنے ان تمام رشتوں کو ساتھ لے کر چلنا پڑتا ہے۔ اسی طرح کا رویہ دفاتر میں چلے جائیں وہاں بھی یہی پایا جاتا ہے کہ ہر ملازم شخص اپنے سینئر کے ساتھ بنا کر رکھنا چاہتا ہے بھلے اُس کو اُس کا سینئر پسند کرے یا نہ کرے۔ دفاتر کے ماحول میں ایک عجیب سلسلہ یہ ہوتا ہے کہ آپ جس بھی آفس میں کام کرتے ہیں اُس کی تمام برانچوں میں جو خواتین و حضرات کام کرتے ہیں کسی نہ کسی وقت کسی نہ کسی دن ایک دوسرے کے ساتھ آپ کا واسطہ ضرور پڑتا ہے لہٰذا اکاؤنٹس والے ایڈمن والوں کے ساتھ اچھا تعلقات رکھنا چاہتے ہیں۔ ایڈمن والے ایچ آر کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنا چاہتے ہیں بینک سیکشن والے آڈٹ والوں کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنا چاہتے ہیں۔

اس میں جو خاص بات آپ کو بتانا چاہ رہا ہوں اُس کا صرف اور صرف مقصد یہ ہے کہ گھر ہو یا دفتر یہ دو ایسے مقامات ہیں جہاں پر انسان کو ذہنی آسودگی کی اشد ضرورت ہوتی ہے اگر کوئی انسان اپنے گھر میں اپنے کسی ناپسندیدہ رشتے کی وجہ سے ڈسٹرب ہے تو وہ آفس میں سکون سے کام نہیں کرسکتا اگر یہی انسان اپنے آفس میں ذہنی طور پر پُرسکون نہیں ہے تو پھر وہ گھر میں بھی سکون کے ساتھ زندگی بسر نہیں کرسکتا اِن حالات کو پیدا کرنے کے جو محرکات ہوتے ہیں اُن میں سب سے بڑا

محرک پسند ناپسند کا ہے۔ یہ سلسلہ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی چلتا ہے غرضیکہ آپ کہیں بھی چلے جائیں جہاں پر آدمی سے آدمی کا واسطہ پڑے گا اُس کو پسند و ناپسند کے تجربے سے گزرنا پڑے گا اور یہ سلسلہ ازل سے چل رہا ہے۔ آپ یہ کہیں گے کہ یہ سلسلہ ازل سے کیسے چل رہا ہے؟ تو وہ بھی بتا دیتا ہوں، وہ ایسے کہ جب تک حضرت آدمؑ کی تخلیق نہیں ہوئی تھی عرش پر جن و ملائکہ رب کی تسبیح کیا کرتے تھے پھر ابلیس جو اپنی عبادات کے زور پر مقرب ترین فرشتوں میں شمار ہوتا تھا اُس نے تکبر کیا اور رب کی نافرمانی کی۔ اس کے بعد آپ سب کو معلوم ہے کہ رب نے کس طرح ابلیس کو اپنے عرش سے نکالا۔ ابلیس نے مہلت مانگی کہ اے رب یہ جو تو نے حضرت آدمؑ کو تخلیق کیا ہے یہ فساد پیدا کرے گا یہ قتل و غارت گری کرے گا۔ مگر رب نے کہا کہ نہیں جو میرے نیک بندوں میں سے ہوں گے وہ میری راہ پر چلیں گے سیدھا راستہ اختیار کریں گے جو کہ میرے نیک لوگوں کا راستہ ہوگا۔ ابلیس نے کہا اے رب مجھے موقع دے کہ میں تیرے اس آدم کو تیرے راستے سے بھٹکا سکوں اور تیری تخلیق کو غلط ثابت کر سکوں۔ رب تعالیٰ نے ابلیس کو یوم حشر تک کے لئے مہلت دیدی اور کہا کہ جا تو یوم حشر تک کوشش کر کے دیکھ لے مگر تو میرے تخلیق کئے ہوئے آدم کو غلط راستوں پر نہیں لے جا سکے گا۔

ازل سے لے کر آج تک یہ سلسلہ پسند و ناپسند کا چل رہا ہے اور اِس میں سب سے بڑا ناپسندیدہ کردار جو پوری کائنات میں ادا کر رہا ہے وہ ابلیس ہے اُس کے بہکاوے میں کچھ ایسے آدم زاد آ جاتے ہیں جن کا ایمان پختہ نہیں ہوتا وہ ابلیس کے بتائے ناپسندیدہ راستے پر چل پڑتے ہیں۔ مگر میرے رب کے جو نیک لوگ ہیں اور جو یوم حشر تک ابلیس کی ناپسندیدگی کو رد کرتے رہیں گے بھلے ابلیس اُن کو رشتے داریوں اور دوستیوں میں غلط راستوں میں ڈالے یا اُن کی روزمرہ کی زندگی میں حرام کھانے پر اکسائے، رشوت لینے پر اکسائے، جھوٹ بولنے پر اکسائے، نیک لوگ کبھی بھی پسندیدہ راستے کو نہیں چھوڑیں گے۔ رب کے حکم اور رحمت سے سراطِ مستقیم پر چلتے رہیں گے جو میرے رب کو سب سے زیادہ پسند ہے۔ قارئین کرام یہ وہ پسند و ناپسند کا تناظر تھا جو میں آپ کے ساتھ بیان کر رہا تھا کہ یہ ازل سے لے کر ابد تک سلسلہ یونہی چلتا رہے گا۔

برداشت

قرآن پاک میں اللہ پاک ارشاد فرماتا ہے کہ اے مومنو! ہم نے تم پر روزے فرض کر دیئے ہیں جیسے کہ تم سے پہلی امتوں پر فرض کیئے گئے تھے۔ روزے کا مطلب ہے کہ ہر اُس جائز اور حلال چیز سے اپنے آپ کو روکنا سحری سے لے کر اذانِ مغرب تک۔ رمضان پورے ایک مہینے کا کورس ہے۔ جس میں کبھی 30 یا کبھی 29 روزے ہوتے ہیں اور اس کا اصل مقصد جو رب تعالیٰ نے فرمایا ہے اور نبی پاکؐ نے روشنی ڈالی ہے وہ یہی ہے کہ اپنے آپ کو ہر اُس جائز کام سے روکنا جو آپ کے قبضۂ قدرت میں ہے کہ آپ وہ کام کر سکتے ہیں مگر رب تعالیٰ نے منع فرمایا ہے اور آپ نے تعمیل کرنی ہے بھلے گرمی ہو، سردی ہو کوئی سا بھی موسم ہو۔ ہر 36 برس کے بعد رمضان کے روزے گرمیوں میں آتے ہیں کیونکہ ہر ایک برس کے بعد 10 دن اسلامی کیلنڈر کے حساب سے روزے پیچھے آتے ہیں اور یوں ایک مہینہ پورا ہونے میں 3 برس لگ جاتے ہیں اور جب 12 ماہ مکمل ہوں تو اُن 12 ماہ کو مکمل ہونے میں 36 برس لگتے ہیں تب جا کر روزے گرمیوں میں اور سردیوں کے روزے سردیوں میں آتے ہیں۔

آج آپ سے ماہ صیام کے حوالے سے بات اس لئے کر رہا ہوں کہ تقریباً ماہ صیام آدھا گزر چکا ہے 14 یا 15 روزے باقی رہ گئے ہیں۔ روزہ رکھنے کا مقصد صرف بھوکا پیاسا رہنا نہیں ہے اس میں ہمیں آنکھ کا روزہ رکھنا ہے زبان کا روزہ رکھنا ہے، کانوں کا روزہ رکھنا ہے، ہاتھوں کا روزہ رکھنا ہے، پیٹ کا روزہ رکھنا ہے، پاؤں کا روزہ رکھنا ہے، غرض یہ کہ اپنے تمام جسمانی اعضاء کا روزہ ہم نے رکھنا ہے۔ ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ پیار محبت سے رہنا ہے روزے کی حالت میں ایک

دوسرے کو برداشت کرنا ہے ایک دوسرے کے غصے کو ایک دوسری کی سخت بات کو بھلے وہ گھر ہو دفتر ہو بازار ہو اسمبلی ہو کوئی بھی جگہ ہو مساجد ہوں سکول ہوں غرضیکہ کوئی بھی جگہ کوئی بھی مقام جہاں سے لوگ گزرتے ہوں پیدل چلتے ہوئے گاڑیاں چلاتے ہوں، رکشہ صاحبان، ریڑھی بان، جو بازاروں میں بیٹھے ہیں اور جو خورونوش کی اشیاء بیچ رہے ہیں اور جنہوں نے مہنگائی رمضان کے مہینے میں انتہا تک پہنچا رکھی ہے ان سب سے گزارش ہے کہ اپنے روزے کو قائم رکھیں اپنے آپ کو روکیں ایسے کام کرنے سے کہ جس سے رب تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ ناپ تول میں بے ایمانی نہ کریں، حلال گوشت کو حلال کر کے بیچیں، حتیٰ کہ ہر وہ چیز جو کہ عام آدمی کے زیر استعمال آتی ہو ان سب چیزوں میں ملاوٹ نہ کریں بے ایمانی کا نہ سوچیں، زیادہ منافع کے بارے میں نہ سوچیں بلکہ عام آدمی کو سہولتیں دیں تاکہ عام انسان اپنے گھر کیلئے اپنی استطاعت کے مطابق اللہ کے حلال رزق میں سے چیزیں خرید کر گھر لے جائے اور اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھ کر روزہ افطار کرے، خوش ہو سب کیلئے دعائے خیر کرے اکہ یارب العالمین میرے ملک میں ایسے لوگ بستے ہیں جو کمزور ناتواں اور اپنے سے کم تر لوگوں کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور اُن کی روزمرہ کی زندگی کو آسان بنانے میں اُن کی مدد فرما رہے ہیں۔

اگر ایسا ہو جائے اور ماہ رمضان میں ہم سب اپنے اپنے حصے کی برداشت درگزر غصہ کنٹرول کرنا شروع کریں، عام اشیائے خورونوش کو بہت زیادہ منافع حاصل کرنے کیلئے استعمال نہ کریں بلکہ کچھ قیمتوں کو اپنے طور پر کم رکھیں تاکہ عام آدمی کو اس پاک اور بابرکت مہینے میں زندگی کی سہولیات آسانی سے دستیاب ہو سکیں اور عید الفطر کو خوش اسلوبی سے اور خوش دلی سے گزار سکیں اور اپنے لئے اپنے گھر والوں کیلئے کپڑے سستے داموں خرید سکیں تاکہ عام آدمی کی زندگی میں بھی خوشیاں سکون سے داخل ہوں۔ انہیں یہ فکر نہ ہو اب عید آ رہی ہے ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں ہم نے اپنے بچوں کیلئے نئے جوتے خریدنے ہیں، نئے کپڑے خریدنے ہیں، مہنگائی بہت زیادہ ہے، ہم ان چیزوں کے خریدنے کیلئے کس سے قرض لیں گے اور کون ہمیں قرض دے گا اور اگر کسی نے قرض دے بھی دیا تو وہ ہم کیسے واپس لوٹائیں گے؟

ہمیں چاہیے کہ ہم ایسے لوگوں کا خیال رکھیں خوشحال گھرانوں سے تعلق رکھنے والے لوگ کم مالی استطاعت رکھنے والوں کی مدد کریں صرف اور صرف اللہ اور اُس کے رسول کو راضی کرنے کیلئے اپنے اندر درگزر پیدا کریں برداشت پیدا کریں، تکبر نہ آنے دیں کسی کے ساتھ بحث مت کریں۔ رمضان میں رب تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی تم سے بحث کرے یا جھگڑا کرے تو اُس کو کہہ دو بھائی میں تم سے نہیں لڑ سکتا میرا روزہ ہے اور یہ عمل ہم سب کو مل کر کرنا ہے۔

ماہ رمضان کا ایک مہینہ ہمیں اُن غریب لوگوں کی یاددہانی کرواتا ہے جن کے پاس پورے سال کھانے کیلئے مالی وسائل نہیں ہوتے۔ یہ مہینہ ایک طرح کا ہمارے لئے تربیتی کورس ہے کہ اپنے مال میں سے اُن لوگوں پر مال خرچ کرو جن کے پاس کچھ نہیں، اپنے مال کو جمع مت رکھو، بینکوں میں بند مت رکھو، سود مت کھاؤ بلکہ اُس کو اللہ کے بندوں پر لگاؤ، اللہ کے بندوں پر لگانے سے تمہارے مال میں برکت بڑھے گی۔ رب کہتا ہے کہ اے بندے تو میرے ساتھ کاروبار کر میں تجھے ایک کی جگہ 70 گنا زیادہ دوں گا تو اپنا مال میرے بندوں پر خرچ کر میں تجھے آسانیاں دیتا چلا جاؤں گا۔ اگر یہی سوچ ہم سب اہل وطن کی ہو جائے تو ہمارے ملک سے بھوک افلاس اور غربت کا خاتمہ ہو جائے گا ہمارا ملک مثالی خوشحال ملک بن جائے گا۔ آیئے رمضان میں سچے دل سے یہ عہد کرتے ہیں کہ ہم غریب کے ساتھ زیادتی نہیں کریں گے اُس کو آسانیاں بہم پہنچائیں گے۔ آمین

زندگی

14 اگست 2018ء کی شام دوست کا فون آیا کہ میں باپ بن گیا ہوں میرے گھر ننھا فرشتہ بیٹے کی صورت میں نمودار ہوا ہے۔ اُس کی آواز میں خوشی کی تھرتھراہٹ میری سماعتوں کو واضح طور پر محسوس ہو رہی تھی، مجھے لگ رہا تھا جیسے اُس نے اپنے رشتے داروں اور احباب کے بعد سب سے پہلا فون مجھے کیا۔ میں نے ہنستے ہوئے اُسے مبارکباد دی اور کہا ''نیا پاکستان مبارک ہو'' ساتھ میں نے موجودہ سیاسی صورتحال کے حوالے سے ایک لائن کا اضافہ کیا کہ ''تبدیلی آئی نہیں تبدیلی آگئی ہے'' اس پر وہ بڑا خوش ہوا۔ میں نے اُسے روایتی انداز میں دُعائیں دیں اور اللہ پاک سے درخواست کی کہ میرے دوست کا بیٹا ہر لحاظ سے صحت مند اور توانا ہو، اپنی زندگی مکمل طور پر بہترین طریقے سے گزارے، اللہ پاک اُس کی مدد فرمائے اور اُس کو اپنی امان میں رکھے۔ آمین

جب فون بند ہو گیا! تو میرے سامنے میرا بیٹا کھڑا تھا وہ مجھے بتا رہا تھا کہ دوستوں کے ساتھ باہر جا رہا ہوں۔ میں نے اُس سے کہا واپسی کتنے بجے تک ہو گی؟ تو اس نے کہا یہی کوئی رات ساڑھے دس گیارہ بج جائیں گے۔ میں نے کہا یہ تو بہت لیٹ ہے اُس نے کہا نہیں جی میرے دوستوں کے ساتھ Get together ہے کوشش کروں گا کہ جلدی آجاؤں۔

آپ لوگوں کو یہ سارے واقعہ سنانے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ ایک وہ بچہ جو 14 اگست کو اس دنیا میں آیا اور ایک میرا بیٹا جو کہ اس 14 اکتوبر 2018ء کو 24 برس کا ہو جائے گا اور میں ایک باپ ہونے کی حیثیت سے اس کیلئے کتنا فکر مند ہوں۔ جبکہ ہم لوگ تو اپنے وقت میں جب مغرب کی اذان ہو جایا کرتی تھی تو ہم جہاں کہیں بھی ہوا کرتے تھے گھروں میں واپس آجایا کرتے کہ مگر شاید جنریشن گیپ اسے ہی کہتے ہیں یا نئی نسل کی ترقی یافتہ سوچ کہہ لیں یا ہمارے جیسے قدامت پسندوں کا خوف کہہ لیں کچھ بھی کہہ لیں مگر میں نے اپنی زندگی میں ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ ہر باپ ہر دور میں اپنے بچوں سے مطمئن نہیں ہوتا اور ہر دور میں بچے اپنے والدین سے اختلافِ رائے رکھتے ہیں۔ جب ہم اپنے دوستوں کے پاس جانے کیلئے والد صاحب سے اجازت لینا ہوتی تھی تو ڈر لگا رہتا تھا اپنی ماں سے کہا کرتے تھے کہ اماں جی باباجی کو کہیں کہ ہم نے دوستوں کے ساتھ جانا ہے تو

پھر بھی ہمیں ڈانٹ پڑا کرتی تھی۔ ہم کبھی بھی اُس وقت خوش نہیں ہوا کرتے تھے سوچا کرتے تھے کہ ہم کب بڑے ہوں گے کب ہماری بات کو عزت ملے گی کب ہم اپنی مرضی کر سکیں گے، کیا ساری عمر اسی ڈر اسی خوف اور اسی اجازت کے تحت زندگی گزارتے رہیں گے؟ مگر پھر جب ہم خود صاحب اولاد ہوئے اور اپنے بیٹے کو گود میں پہلی دفعہ اُٹھایا پہلی دفعہ اُس کا ہاتھ پکڑا کر اُس کی انگلی تھام کے اپنے صحن میں چند قدم چلے دونوں باپ بیٹا تو آپ یقین مانئے شاید ہر باپ کی خوشی کی انتہا نہیں رہتی کہ وہ کتنا سرور کا عالم ہوتا ہے جب آپ کا بیٹا آپ کی آنکھوں کے سامنے بڑے ہونے کے مدارج طے کرتا ہے۔ پہلا دن سکول کا، پہلی دفعہ پاس ہونا، پھر آہستہ آہستہ پوری زندگی کا سفر ایک فلم کی طرح ڈرامے کی طرح چلتا ہے اور زندگی دن مہینوں اور سالوں کا سفر بڑی خاموشی کے ساتھ طے کرتی ہوئی گزر جاتی ہے۔

جب باپ اپنا چہرا آئینے میں دیکھتا ہے تو اُس وقت اُس کو احساس ہوتا ہے کہ وہ عمر کی اُس دہلیز پر پہنچ چکا ہے جہاں پر اُسے اپنے بیٹے کو اپنے وارث کو اپنے خاندان کی حکومت منتقل کرنی ہے مگر یہ وہ لمحہ ہوتا ہے کہ بیٹے اور باپ کے درمیان وہی ایک فاصلہ ایک دھند جو کہ پہلے باپ بیٹے کے رشتے میں حائل ہوتی ہے اور باپ بیٹے سے مطمئن نہیں ہوتا وہی بیٹا جس کیلئے باپ نے ساری زندگی اس آس پر گزار دی ہوتی ہے کہ میرا بیٹا جب بڑا ہوگا جوان ہو کر فوج میں جائے گا، انجینئر بنے گا، پائلٹ بنے گا۔ جب یہ خواب پورے نہیں ہوتے تو باپ کو بڑی شدید تکلیف سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

کبھی کبھی آپ نے دیکھا ہوگا اُن بچوں کی آنکھوں کو جن میں کتنے خواب ہوں گے کہ وہ بھی ہمارے بچوں کے ساتھ سکول جائیں اچھی تعلیم حاصل کریں، صاف ستھرا یونیفارم پہنیں، اپنے ماں باپ کے ساتھ خوشگوار زندگی گزاریں۔ بے شمار ایسے بچے مجھے گلیوں، محلوں اور سڑکوں پر نظر آتے ہیں مگر میں صرف بات کر رہا ہوں باپ اور بیٹے کے رشتے کی اور اُس جنریشن گیپ کی جو کہ ہر دور میں ہر باپ اور ہر بیٹے کو ایک دوسرے سے وراثت میں ملتی ہے۔

ACR

میرے پڑھنے والے آج سوچ میں پڑھ گئے ہوں گے کہ یہ ACR کیا ہے۔آپ حیران نہ ہوں آپ میں سے اکثر لوگ یہ جانتے ہیں کہ اے سی آر کا مفہوم کیا ہے۔چلیں میں آپ کو بتا دیتا ہوں جیسے کہ آپ لوگوں کو پتا ہے کہ دسمبر آدھے سے زیادہ گزر چکا ہے ہمارے سرکاری نظام میں ایک ٹرم بولی جاتی ہے جو کہ ہمارے BPS-07 سے شروع ہوتی ہے اور اوپر 17,18 گریڈ تک کے ملازمین کیلئے استعمال کی جاتی ہے جسے اے سی آر Annual Confindential Report کہتے ہیں ہر سرکاری ملازم کو دوران ملازمت ہر سال اِس پل سے گزرنا پڑتا ہے۔اِس رپورٹ کا مقصد بظاہر یہ ہوتا ہے کہ ملازمین جو کہ اپنے اپنے گریڈوں میں کام کر رہے ہیں وہ اپنا کام تندہی، دلجمی اور ذمہ داری سے سرانجام دیں تاکہ وہ جس ادارے میں کام کر رہے ہیں اُس کی ترقی اور خوشحالی میں اضافہ ہو۔

انگریز بہادر نے برصغیر پاک و ہند میں اے سی آر کا رواج ڈالا اور وہ بھی خاص طور پر سرکاری اداروں اور محکموں میں۔مگر مجھے افسوس سے یہ لکھنا پڑ رہا ہے کہ جو سینئر اپنے جونیئر کی اے سی آر یعنی 12 ماہ کی یا ایک برس کے کام کی رپورٹ لکھنے بیٹھتا ہے تو وہ نہایت عدل و انصاف کو ملحوظ رکھتا ہے کبھی کبھی یہ رپورٹ سرکاری اداروں کے ملازمین کیلئے جسے Anuual Confidential Revenge بن جاتی ہے جبکہ ایسا نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے سرکاری ملازم کی عملی زندگی میں یہ رپورٹ ترقی کا زینہ بنتی ہے مگر چند سخت دل افسران اور کم ظرف حضرات متوسط طبقے کے سرکاری ملازمین کو اپنی ضد اور عناد کا نشانہ بناتے ہیں اور انہیں Below Average یا Average کر دیتے ہیں اگر اُن کے قلم کی سیاہی ایسے ملازمین کو Good

Very Good اور Excellent لکھ دے تو اُن کے پلے سے کچھ بھی نہیں جائے گا اُلٹا یہ لوگ دُعائیں دیں گے اور ان کے بچوں کیلئے بھی اُن کے دلوں سے دُعائیں نکلیں گی اور اگر یہ افسران بالا اے سی آر اپنے ملازمین کے حق میں نہیں لکھیں گے تو پھر ان کے دلوں سے بدعائیں ضرور نکلیں گی۔

میرا تمام افسران بالا سے مطالبہ ہے کہ کبھی بھی اپنے سے جونیئر اور کمزور پر ظلم مت کریں بلکہ انہیں آسانیاں دیں، اُن کیلئے اپنے دلوں میں نرم گوشہ رکھیں کیونکہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے اگر آپ اپنے جونیئر ملازمین کو کام کرنے کیلئے خوشگوار ماحول اور ذہنی آسودگی دیں گے تو آپ کے ماتحت کام کرنے والے خوش دلی سے کارِ سرکار انجام دیں گے جس کی وجہ سے تمام ملکی ادارے خوشحال اور ترقی کی منازل طے کرتے چلیں جائیں گے۔ اس طرح آفیسر اور ماتحت کے درمیان کوئی خلیج حائل نہیں ہوگی کیونکہ آفیسر، آفیسر تب ہی بنتا ہے جب وہ اپنے ماتحت ملازمین کا خیال رکھے اُن کے درپیش مسائل حل کرنے میں تعاون کرے، چھوٹی چھوٹی غلطیوں کو درگزر کرے۔

اپنے اندر تحمل اور خوش مزاجی پیدا کریں جو کہ موجودہ سرکاری نظام میں نہ ہونے کے برابر ہے جس کی وجہ سے سرکاری ادارے تنزلی کا شکار ہو رہے ہیں۔ ہمیں اپنے قومی اداروں سے مثبت کام لینا ہے اور مثبت طریقوں سے اپنے ماتحتوں کو آسانیاں پہنچانی ہیں تا کہ ہمارا ملک خوشحال ہوسکے۔ میں تمام افسران بالا سے پرزور گزارش کروں گا کہ آپ جب بھی ہر سال دسمبر کے آخر میں اپنے جونیئر افسران اور سٹاف کی ACR لکھنے بیٹھیں تو یہ ذہن میں ضرور رکھیں کہ کوئی آپ کی بھی Annual Confidential Report لکھ رہا ہے اور وہ کوئی اور نہیں اِس دنیا کا مالک ربِ کائنات ہے۔

میں تمام جونیئر افسران اور سٹاف ممبران سے بھی گزارش کروں گا کہ وہ اپنے ادارے اور افسران کے ساتھ دوستانہ مخلصانہ رویہ رکھیں۔

انگوٹھا

یقیناً مضمون کے نام سے آپ حیران تو ہوئیں ہوں گے، انگوٹھا اتفاق سے آگیا ہے۔
ہوا کچھ یوں کہ دو دن پہلے میں اپنے گھر سے نکلا آفس جانے کیلیئے، آفس پہنچا میں گراؤنڈ فلور پر کھڑا تھا وہاں سے میں نے ایل جی یعنی لوئر گراؤنڈ فلور پر جانا تھا اُس کیلیئے میں نے حسب معمول سیڑھیوں کا استعمال کرنا تھا جو کہ میں پہلے بھی کرتا رہا ہوں۔ مگر اُس دن جب میں ریلنگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے سہارا لے کر سیڑھیاں اُتر رہا تھا کہ اچانک اُس ریلنگ میں سے ایک پیس ٹوٹا۔ میرا ہاتھ انگوٹھے سمیت ریلنگ ٹوٹنے کی وجہ سے سیڑھیوں کے نیچے جو فریم بنا تھا اُس میں پھنس گیا، میرا دایاں انگوٹھا شدید زخمی ہو گیا۔ فوری طور پر میں نے اپنا ہاتھ اُس میں سے نکالا اور آفس کے کمرے میں جا کر بیٹھ گیا گو کہ مجھے اُس وقت انگوٹھے میں شدید درد ہو رہا تھا اور تکلیف بھی تھی مگر ہماری ڈسپنسری 8 بجے کے بعد کھلتی ہے تب تک مجھے کوئی میڈیکل ایڈ نہیں مل سکتی تھی۔ خیر خدا خدا کر کے 8 بجے اور میں فوری طور پر اپنے میڈیکل سینٹر پر گیا ابھی ڈاکٹر صاحب نہیں آئے تھے ڈیوٹی پر موجود ڈسپنسر نے میرے انگوٹھے پر دوائی لگائی پٹی باندھی اور پین کلر گولیاں دیں وہ میں لے کر اپنے آفس آ کر بیٹھ گیا۔ تمام دوست اور ساتھی آنے شروع ہوئے آفس میں، انہوں نے پوچھا کیا ہوا تو میں نے کہا انگوٹھے پر چوٹ لگ گئی ہے سب ہنسنے لگے اور مذاق کرنے لگے۔ چل آج پھر چھٹی کر، موج کر۔ میں نے کہا مجھے واقعی شدید تکلیف ہے۔

یہ وہ لمحہ تھا جبکہ میں پین پکڑ کر اپنی حاضری بھی نہیں لگا سکتا تھا۔ اچانک میرے دل میں خیال آیا میرے ہاتھ کی چار انگلیاں ٹھیک ہیں مگر ایک انگوٹھا جس کو کبھی ہم نے اتنی اہمیت نہیں دی آج کتنا

اہم اور ضروری بن گیا ہے کہ میں اپنا قلم بھی صحیح طریقے سے نہیں پکڑ سکتا۔ اسی طرح مجھے اپنے ملک اور قوم کے بارے میں خیال آیا مجھے ایسا لگا ہمارے نظام کا انگوٹھا ٹوٹا ہوا ہے جس کی وجہ سے کوئی بھی کام صحیح طریقے سے نہیں ہو رہا ہر طرف بے چینی ہے، کوئی ادارہ بھی ترقی نہیں کر رہا۔ آپ قومی بینک لے لیں، قومی ائیر لائن لے لیں، پاکستان سٹیل لے لیں، پی ٹی وی لے لیں، ریڈیو پاکستان لے لیں، فنکاروں، ادیبوں، شاعروں، موسیقاروں اور کسی بھی فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والے اداروں کو لے لیں سب کا انگوٹھا ٹوٹا ہوا ملے گا۔

یہ انگوٹھا بہت ضروری ہے بھلے کسی انسان کا ہو یا کسی ادارے کا اُسے ہر حالت میں صحیح سالم رہنا چاہیے کیونکہ اگر ہمارے اداروں، دانشوروں اور صاحب فراست لوگوں کے انگوٹھے ٹوٹ گئے تو ملک کبھی ترقی نہیں کر سکے گا ہاتھ کی چار انگلیاں کافی نہیں ہوتیں۔ انگوٹھا ہماری شناخت ہے قومی شناختی کارڈ پر بھی اور پاسپورٹ پر بھی انگوٹھے کے نشان ثبت کیئے جاتے ہیں۔ یہ عمل پوری دنیا میں دہرایا جاتا اور کیا جاتا ہے۔ اِس خیال کے آتے ہی اپنی بے بسی عیاں ہو گئی گو کہ میں ایک مکمل انسان ہوں مگر میرا انگوٹھا جس پر چوٹ لگی اور وہ ہاتھ میں قلم پکڑنے کی بھی طاقت نہیں رکھتا تو مجھے سمجھ آیا کہ ہمارے ملک کا مجموعی طور پر باقی سب کچھ ٹھیک ہے بس انگوٹھا زخمی ہے اگر انگوٹھا صحیح ہو گا تو ملک دن دگنی، رات چوگنی ترقی کر سکے گا۔

یہ میں آپ کو بڑے وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ کسی دن آپ بھی اپنے انگوٹھے پر پٹی باندھ کر اُسے ناقابل استعمال بنائیں پھر دیکھیں کہ آپ کیا کام کر سکتے ہیں، بھلے آپ کی چار انگلیاں سلامت ہوں ہاتھ کی ہتھیلی مکمل ہو اور انگوٹھا نہ ہو تو پھر نہ آپ قلم پکڑ سکتے ہیں، نہ کاغذ اُٹھا سکتے ہیں، نہ پانی پی سکتے ہیں، نہ کھانا کھا سکتے ہیں۔ جن قوموں کے انگوٹھے ٹوٹے ہوں وہ بھلا ترقی کیسے کر سکتی ہیں؟

آنکھ

انسانی وجود کے اندر سب سے زیادہ طاقتور عضو آنکھ ہے۔ آنکھ بالکل ایسی ہے جس طرح آپ کے گھر کا دروازہ جب تک آپ دروازہ نہیں کھولیں گے کوئی آپ کے گھر میں داخل نہیں ہوسکتا۔ انسانی بدن میں آنکھ دروازے کا کام دیتی ہے یہ دروازہ انسان سے انسان کی ملاقات کا دروازہ ہے۔ جب آنکھ آنکھ سے ملتی ہے تو انسانی دل و دماغ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہونا شروع ہو جاتی ہے ایک دوسرے کو جانے بغیر نام بتائے بغیر آنکھوں سے آنکھوں کی گفتگو کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے بھلے وہ کوئی عام آدمی ہو آپ کا دوست ہو کوئی خوبصورت خاتون ہو آپ کے بہن بھائی رشتہ دار ہوں۔ سب کی آنکھ جب کھلتی ہے دوسرے سے ملتی ہے تو مکالمہ شروع ہو جاتا ہے پھر یہ مکالمہ آواز کا روپ دھارتا ہے۔ ایک دوسرے سے تعارف ہوتا ہے پھر یہ سلسلہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔

میں اکثر کہا کرتا ہوں خاص طور پر نوجوانوں کیلئے آنکھ پہلا "چور دروازہ" ہے جس کے ذریعے انسانی روح میں نقب لگائی جاسکتی ہے۔ بقول اقبال کے "نگاہ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں" اب یہ وہ نگاہ ہے جس کے بارے میں اقبال نے آگاہی دی ہے جس میں ایمانداری ہے حیا ہے محبت ہے خلوص ہے رواداری ہے مگر بدقسمتی سے آج کے معاشرے میں آنکھ کا چور دروازہ صرف اور صرف بے راہ روی، بے حیائی، لچر پن، منفی خیالات اور منصوبوں کے حوالے سے کیا جارہا ہے۔ آنکھ کا استعمال وہ نہیں رہا جو کہ ہمارے اسلاف کیا کرتے تھے اپنے جوانوں اور بچوں کو حیا کا درس دیا کرتے تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کئی بار فرمایا کہ اپنی نگاہیں نیچی

کر کے بازاروں میں چلا پھرا کرو اور اگر اتفاق سے کسی عورت پر نظر پڑ جائے تو فوراً اپنی نگاہ نیچے کر لو۔ مگر مجھے نہایت دکھ سے کہنا پڑ رہا ہے کہ ہم لوگوں نے اپنی آنکھوں سے حیا ختم کر دی ہے ہم صرف اور صرف منفی سوچ رکھنے والے لوگ بن کر رہ گئے ہیں۔

کسی بھی بااخلاق اور پڑھے لکھے معاشرے میں رہنے والے خواتین و حضرات کیلئے اپنے آپ کو اِن منفی رویوں سے بچانا بہت مشکل کام ہوتا جا رہا ہے ہماری آنے والی نسل بھی اسی آنکھ کے چکر میں الجھ کر رہ گئی ہے، آنکھ کیساتھ ساتھ موبائل نے بھی ہمارے معاشرے میں بہت زیادہ گندگی پھیلا دی ہے اِس کی ایک وجہ جو میری سمجھ میں آتی ہے وہ ہے آنکھ سے آنکھ کا تعلق قائم ہونا۔ جب تک ہم لوگ باحیا نہیں ہوں گے گناہ کی طرف قدم بڑھانا آسان ہوتا چلا جائے گا۔ یہ وہ سونامی ہے جس سے بچاؤ کا واحد راستہ حیا ہے جو کہ آنکھ میں ہونی چاہیے دل میں ہونی چاہیے اگر ہم ایسا نہیں کر سکتے تو ہم خود کو مہذب اور ترقی یافتہ قوم نہیں بنا سکیں گے۔ مغربی اقوام کے ساتھ اپنا موازنہ کریں تو آپ حیران رہ جائیں گے کہ وہ لوگ جو کچھ کرتے ہیں اپنی روزمرہ زندگی میں کرتے ہیں اُنہیں کسی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا انہیں کوئی نہ روکنے والا ہے نہ ٹوکنے والا۔ گو کہ مادی طور پر وہ اقوام ہم سے بہت زیادہ ترقی یافتہ ہیں مگر اُن کے پاس آج ہے آنے والا کل نہیں اس لئے وہ اپنے آج میں پوری انسانی خواہشات کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ اللہ اور پیارے نبی کریمؐ نے ہمیں یوم حشر کا دن بھی یاد رکھنے کو کہا ہے۔ اسی وجہ سے ہم اپنے آپ کو برائی اور بے حیائی سے بچا سکتے ہیں خوفِ خدا کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے رب سے پیار محبت اور عشق رسول کی وجہ سے، ہمارے آباؤ اجداد نے بھی یہی سبق دیا اور سکھایا وہ بقول علامہ اقبال کہ

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

ہم جنہیں حرفِ دُعا یاد نہیں

زندگی پوری کائنات میں پھیلی ہوئی ہے اور اِس زندگی کی وجہ سے پوری کائنات رب کے حکم سے چل رہی ہے رب نے جو کہ تمام کائنات کا مالک ہے اور جس کے قبضہ ٔ قدرت میں تمام جہانوں کی حاکمیت ہے جو کہ کرسی عرش پر بلا شرکتِ غیر واحد بیٹھا ہوا ہے اُس کا کوئی شریک نہیں انسان کی تخلیق سے پہلے اُس نے جن اور ملائیک بنائے جو اُس کی تسبیح کرتے اُس کی حاکمیت مانتے ہیں مگر پھر رب نے مٹی سے حضرت آدمؑ کی تخلیق کی ملائیکہ اور جنات کو حکم دیا کہ حضرت آدمؑ کے آگے سر جھکا لیں مگر جنوں میں سے ایک جن جو کہ آگ سے بنایا گیا تھا اُس نے تکبر میں آکر رب کی نافرمانی کی جس کی پاداش میں اُسے سزا کے طور پر کائنات میں در بدر کر دیا گیا۔ اُس نے رب سے مہلت مانگی کہ اے رب مجھے قیامت تک کیلئے مہلت دیدے۔

اور پھر وہ دن اور آج کا دن مخلوق خدا اور ابلیس کے درمیان خیر وشر کی کشمکش شروع ہوگئی اور یہ کشمکش آج تک چل رہی ہے غور سے دیکھا جائے تو آج پوری کائنات بظاہر ابلیس کے نرغے میں پھنسی نظر آتی ہے جس کی بناء پر آج پورے دنیا میں کوئی بھی ملک اُٹھا کر دیکھ لیں بدامنی بے سکونی اور قتل و غارت گری کا نقشہ ہے بالخصوص موجودہ دور تمام اہل مسلم کیلئے بہت زیادہ تنگ کیا جا رہا ہے۔ افغانستان کو دیکھ لیں، لبنان میں دیکھ لیں، عراق میں دیکھ لیں، لیبیا میں دیکھ لیں، شام میں دیکھ لیں، یمن میں دیکھ لیں، یورپ میں جہاں پر مسلمانوں کی آبادی ہے بوسنیا کو دیکھ لیں، اُن پر شیطانی اور ابلیسی قوتوں کا اثر بہت زیادہ ہے۔ فلسطین، کشمیر اور اب برما کے مسلمانوں پر بے تحاشا مظالم ڈھائے جا رہے ہیں اُن کو بھیڑ بکریوں سے بھی بدتر طریقے سے ذبح کیا جا رہا ہے ابلیسی

قوتوں نے مخلوق پر دنیا تنگ کر رکھی ہے۔ افسوس کی بات سب سے زیادہ یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اپنے مسلمان بھائی نہ پناہ دے رہے ہیں نہ ہی مالی طور پر مدد کر رہے ہیں۔ مالی طور پر تو دور کی بات غیرت کی اِس حد تک کمی ہو چکی ہے کہ یہ حکومتی سطح پر بھی اِن لوگوں کی مدد کرنے کو تیار نہیں ہو رہے ماسوائے ترکی نے کچھ کوشش کی ہے اُس نے اِن لوگوں کو اپنے ملک میں آنے کی اجازت تو نہیں دی بلکہ مالی طور پر سہولت دینے کا اعلان کیا ہے جو کہ کافی نہیں۔

پاکستان نے حکومتی سطح پر کوئی بہت بڑا اعلان یا اقدام ابھی تک نہیں کیا ماسوائے اس کے چند انسانی حقوق کی علمبردار تنظیموں نے مذمتی جلوس نکالنے اور کاغذی قرار دادیں منظور کرنے کا اہتمام کیا مجھے نہایت افسوس سے یہ لکھنا پڑ رہا ہے کہ بقول اقبال

یہ اُمت خرافات میں کھو گئی ہے

آیئے ہم سب مل کر بیٹھیں سر جوڑیں گو کہ ہم کسی کو زندگی دینے کے حق دار تو نہیں کیونکہ رب کا حکم ہے کہ جو نفس بھی دنیا میں آیا ہے وہ فانی ہے اُس کو واپس جانا ہے مگر آیئے کوشش کریں اِس دنیا سے جانے سے پہلے کچھ ایسے اقدامات کر جائیں جو کہ ہمارے نبی کی تعلیمات اور اللہ کے حکم کی روشنی میں ہوں اور جن کی بدولت تمام مسلم اُمہ اپنے ایسے بے یار و مددگار مسلمان بہن بھائیوں اور بچوں کیلئے اِس دنیا میں ایک پُر سکون اور پُر اُمن خطہ بنانے میں کامیاب ہو سکیں جس میں نہ صرف مسلم بلکہ غیر مسلموں کے ساتھ بھی پیار محبت اور رواداری کا سلوک کیا جائے تا کہ جب ہم لوگ اس دنیا سے جائیں تو اپنے رب کے سامنے شرمندہ نہ ہوں کیونکہ رب نے ہمیں کائنات میں خیر پھیلانے کیلئے تخلیق کیا تھا نہ کہ شر پھیلانے والی قوتوں کا ساتھ دینے کیلئے دنیا میں بھیجا۔

آیئے عرض گزاریں کہ نگارِ ہستی

زہرِ امروز میں شرینیٔ فردا بھر دے

آئیے ہاتھ اُٹھائیں

ہر دن، ہر ہفتے، ہر ماہ اور ہر سال اپنے آپ سے یہ عہد کرتا ہوں کہ جو آنے والی باقی زندگی ہے اُس کو مثبت رویوں کے ساتھ بسر کروں گا اپنے اردگرد دوست احباب، بہن بھائی، رشتہ دار میرے مختلف اداروں میں کام کرنے والے وہ حضرات جن سے کہ میرا واسطہ پڑے گا، رابطہ رہے گا اُن میں چٹھی رساں سے لے کر سڑک پر جھاڑو دینے والے خاکروب تک، میرے گھر میں کام کرنے والے ملازم، میٹر ریڈر، لائن مین، بینک میں بل جمع کرنے والے بابو، رکشہ ڈرائیور، ٹیکسی ڈرائیور، محلے کا سبزی والا، وہ قصاب جس سے میں گھر کیلئے گوشت خریدتا ہوں، میرے بال تراشنے والا، میرے کپڑے سینے والا درزی، میرے بوٹ پالش کرنے والا وہ پٹھان بچہ جو کہ اکثر سروسز اسٹیشنز پر جہاں پر گاڑیاں دھوئی جاتی ہیں وہاں آجاتا ہے، پیٹرول پمپ والے مزدور، ہمارے بچوں کو سکول، کالجز پک اینڈ ڈراپ کرنے والے اساتذہ کرام، اخبار پھینکنے والا ہاکر، کیبل آپریٹرز، ہمارے گھروں میں غمی خوشی کے موقع پر کھانا پکانے والے تمام حضرات کے ساتھ پیار سے پیش آنے کا عہد کرتا ہوں۔ دعا کرتا رہتا ہوں کہ ہم سب لوگ بطور قوم اسی طرح ایک دوسرے کے ساتھ رابطے میں رہیں اپنے اپنے رشتوں اور تعلقات کو احسن طریقے سے نبھاتے رہیں تاکہ ہماری روزمرہ کی زندگی پرامن اور مثبت طریقے سے بسر ہو سکے۔

ہم میں سے جو لوگ مالی طور پر مستحکم ہیں وہ ایسے لوگوں کی امداد دل کھول کر کریں جو کسی نہ کسی مجبوری کی وجہ سے تنگدستی کا شکار ہیں ہمارے اندر صلہ رحمی حد سے زیادہ ہونی چاہیے ہمیں اپنے نفوس پر کنٹرول ہونا چاہیے ہمیں ایک دوسرے کی غلطیوں کو معاف کر دینا چاہیے ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہیے چاہے کسی بھی طرح کی صورتحال ہو۔ انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر ہمیں ایک قوم بن کر اکٹھے رہنا ہے اگر ہم اپنے اندر سے حسد نفرت، بغض، عناد ختم کر دیں اگر ختم نہیں کر سکتے تو اُسے کم سے کم ضرور کر دیں کسی ضرورت مند کی حاجت پوری کریں کیونکہ ہم نے بھی اپنے سے کچھ نہیں دینا

جو کچھ بھی دینا ہے رب تعالیٰ کے دیئے ہوئے میں سے دینا ہے۔

ہمیں یہ بات ہرگز نہیں بھولنی چاہیے کہ دنیا میں کوئی چیز بھی کسی کی ملکیت نہیں حتیٰ کہ انسانوں کے اعضاء بھی اپنے نہیں ہوتے وہ بھی رب تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں میں سے نعمتیں ہیں لہٰذا ہمیں چاہیے کہ اپنے اندر کشادگی لائیں، ظرف بڑھائیں ہمارے اندر کم ظرفی پیدا نہ ہو کسی کی کامیابی پر حسد نہ کریں کسی کی تکلیف پر خوش نہ ہوں۔ ہمیں ایک دوسرے کا بالکل اسی طرح سے خیال رکھنا ہے جس طرح سے ہم اپنا خیال رکھتے ہیں، جب گرمیوں کا موسم آتا ہے تو ہم اپنے آپ کو اپنے جسم کو گرم ہواؤں سے بچاتے ہیں ٹھنڈی ہوا اور اے سی والے کمرے تلاش کرتے ہیں پھر جب جاڑے کا موسم آتا ہے تو ہم کمبل رضائیاں سوئیٹرز اور گرم ملبوسات کا استعمال شروع کر دیتے ہیں تا کہ موسموں کے تغیرات کی وجہ سے اپنے جسم میں کوئی بڑی بیماری نہ پال لیں۔ بالکل اسی طرح سے ملک ایک جسم کی مانند ہے اور ہم سب پوری قوم اس جسم کے حصے ہیں ہمیں مشکل حالات اور سخت موسموں میں اپنے ملک کی حفاظت بالکل ایسے ہی کرنی ہے جیسے ہم اپنے بدن کی کرتے ہیں اپنے گھر کی حفاظت کرتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مومن ایک دوسرے کیلئے ایسے ہیں جیسے گھر کی دیواروں میں لگی ہوئی اینٹیں اگر عمارت میں سے ایک اینٹ نکال دی جائے تو اُس کا نقصان پوری عمارت کو ہوتا ہے۔ اسی طرح سے اگر انسانی جسم کے کسی حصے میں بھی کوئی ذرا سی تکلیف ہو جائے تو پورا بدن اُس تکلیف کی وجہ سے بے چین ہو جاتا ہے۔ یہی حال اور احساس ہمیں ملک کے حوالے سے بھی ہونا چاہیے کہ ہم لوگ اپنے ملک کو وجود کا حصہ تصور کریں ملک کے کسی بھی کونے میں کسی کو بھی کوئی تکلیف اور نقصان پہنچے تو ہم سب ایک بدن کی طرح بے چین ہو جایا کریں اور اگر ملک میں کوئی خوشی کا لمحہ آئے تو ہم سب اُس خوشی کو جھوم جھوم کر منایا کریں اور اپنے ملک کیلئے ہر وقت خیر کی بات کیا کریں۔

آیئے ہاتھ اُٹھائیں ہم بھی
ہم جنھیں حرف دُعا یاد نہیں

بے حسی

کبھی آپ نے غور کیا ہے جیسے جیسے دنیا میں ترقی ہوئی اور ترقی سے بے شمار فوائد حاصل ہوئے سہولتیں ملیں آسانیاں میسر آئیں مگر اس کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ قریبی تعلق کم سے کم ہوتا چلا گیا۔ موجودہ دور جس میں کہ ہم پوری دنیا کے ساتھ رابطے میں ہیں بھلے وہ شمالی امریکہ ہو یا چین، ناروے ہو یا جاپان ہمیں پل پل کی خبر اور معلومات ملتی رہتی ہیں۔ آپ نے کبھی غور کیا کہ ان تمام خبروں میں پوری دنیا میں دو چیزیں بہت زیادہ نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہیں ایک بدامنی بے سکونی اور دوسری لاتعلقی بے حسی۔

ہم ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے اور رابطے میں رہتے محسوس تو ہوتے ہیں مگر دراصل ہم پوری دنیا والے اندر سے ایک دوسرے سے لاتعلق ہو چکے ہیں موجودہ دور کی مشینی ترقی نے وقتی طور پر آسائشیں فراہم کی ہیں مگر اِن کیساتھ ساتھ انسانی رویوں میں بے چینی اور لاتعلقی حد سے زیادہ بڑھ چکی ہے پوری دنیا میں نفسانفسی کا عالم ہے ہم سب نفسانفسی اور بھیڑ چال کے بیچ میں پھنس کر رہ گئے ہیں۔

پہلے میں سوچا کرتا تھا کہ شاید مغرب کے پاس صرف آج ہے اور ہم مسلمانوں میں جو کہ دین اسلام سے پیار کرتے ہیں اُن کے پاس آج اور آنے والا کل بھی ہے۔ مگر دنیا کے موجودہ حالات دیکھتے ہوئے اور خاص طور پر مسلم ممالک میں جو بے راہ روی، بدامنی اور انتشار پھیلایا جا رہا ہے اور جس کی اصل وجہ دنیا میں مواصلاتی نظام کا عام ہو جانا اور تمام بُری خبریں قتل و دہشت گردی ہو، لوٹ مار ہو، جنگ و جدل ہو، منی لانڈرنگ ہو، بے ایمانی ہو، جھوٹ ہو، بے حسی ہو اِن تمام نے انسانی رشتوں کے تقدس کو پامال کر دیا ہے۔ ہم بطور انسان ایک دوسرے سے تعاون کرنے کیلئے کسی بھی مقام پر تیار نہیں، ہم مادہ پرست ہو چکے ہیں اور اِس مادہ پرستی نے ہمارے اندر خود غرضی اور لالچ

کو پیدا کر دیا ہے خوف خدا ہمارے اندر سے ختم ہو چکا ہے۔ معاشرے میں کہیں بھی کوئی بڑا حادثہ کوئی واقعہ کوئی ناگہانی مصیبت آ جائے تو ہم اُسے کوئی اہمیت نہیں دیتے صرف اخبار کی ہیڈ لائن، ٹی وی چینلز کی بریکنگ نیوز سے زیادہ اُس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

اس کی وجہ جو میں سمجھ پایا ہوں وہ ہے بے حسی جس نے سب کو ایک دوسرے سے دور کر دیا ہے اور جس کی وجہ سے انسانی اقدار اور دینی روایات مکمل طور پر تباہ ہو چکی ہیں۔ ہم نے نئی نسل کو ایسی بے حسی سے بچانا ہے تو اپنے اندر نرم و گداز رویئے دوبارہ پیدا کرنے پڑیں گے جن کی بدولت ہم ایک دوسرے کے ساتھ پیار اور محبت کے ساتھ رہ سکیں ایک دوسرے کو برداشت کر سکیں ایک دوسرے کی غلطیاں معاف کر سکیں ایک دوسرے سے محبت کریں نفرت کے بیج جو دلوں میں بوئے جا چکے ہیں اُن کو پیار کے پانی سے دھویا جائے اور اپنے ذہنوں کو کشادہ اور وسیع کیا جائے۔

جس طرح آج کا انسان بڑے بڑے گھروں میں رہنا پسند کرتا ہے اُسی طرح وہ اپنے دلوں میں کشادگی پیدا کرے ایک دوسرے کا احترام کرنا سیکھے ایک دوسرے کی تکلیف کو شیئر کرنا سیکھیں۔

نبی کریمؐ کا فرمان ہے انسانی جسم کی حیثیت ایک عمارت کی طرح سے ہے اگر اس میں سے ایک اینٹ بھی نکال دی جائے تو پوری عمارت کو اِس کا نقصان ہوگا۔ ایک اور مقام پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر جسم کے کسی بھی حصے میں تکلیف ہو تو اُس کی درد پورے بدن میں محسوس ہوتی ہے۔

یہی وہ سوچ اور رویہ ہے جس کی طرف ہمیں لوٹ کر جانا ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ

ہے دل کیلئے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

بند گلی

07 اکتوبر 2017ء کو اچانک میرے دوست کا فون آیا، یار میں لاہور جا رہا ہوں تو چلے گا تو تیار ہو جا، میں دس منٹ میں تجھے لینے آرہا ہوں۔ ابھی صبح کے 6 بجے تھے میں جلدی جلدی اُٹھا کپڑے پہنے تیار ہوا ابھی اپنے سر کے مختصر بالوں کو سیدھا کر رہا تھا کہ اُس کی گاڑی کا ہارن بجا۔ میں جلدی سے گھر سے باہر نکلا اُس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا پھر ہم براستہ اسلام آباد موٹروے سے ہوتے ہوئے لاہور کی جانب چل پڑے۔ جب کلر کہار آیا میرے دوست نے کہا کہ چل یار ناشتہ یہاں کرتے ہیں اُس وقت سورج پوری طرح طلوع ہو چکا تھا ہم نے کلر کہار خوبصورت جھیل کے کنارے بیٹھ کر ناشتہ کیا پھر وہاں سے نکل کر لاہور کی طرف چل پڑے۔ تقریباً ساڑھے گیارہ بجے کے قریب ہم موٹروے ٹول پلازہ لاہور پر کھڑے تھے پھر ہم اپنے رہنے کی جگہ ایم ایم عالم روڈ پر چلے گئے وہاں ہوٹل میں ایک کمرہ لیا میرا دوست لیٹ گیا اور کہا، میں تھکا ہوا ہوں دو ڈھائی گھنٹے آرام کروں گا اس دوران میں جاگتا رہا اور لاہور میں اپنے دوستوں کے ساتھ ٹیلی فون پر رابطے میں رہا۔ اُن میں سے میرے بہت محترم دوست نامور کارٹونسٹ جاوید اقبال، فلم سٹار بابر علی، علی رضا اور فن کدہ پاکستان کے لاہور کی کنو یز سے فون پر ٹائم طے کیا۔ 3 بجے آپ سے ملاقات ہوگی 5 بجے کا ٹائم جاوید اقبال صاحب سے ملنے کا طے کیا اور پھر رات 9 بجے فلم سٹار بابر علی کے ساتھ ملاقات کا وقت طے ہوا۔

ابھی میرا دوست کمرے میں سو رہا تھا میں ٹیکسی منگوا کر 3 بجے ہوٹل سے چل پڑا شیڈول کے مطابق

سب سے پہلے فن کدہ پاکستان کی کنوینز سے ملاقات کی لاہور میں پروگرام کرنے کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی اُن کے ساتھ ٹائم گزارنے کا پتہ ہی نہیں چلا پھر ساڑھے پانچ بجے اُن سے اجازت لی اور جاوید اقبال کے پاس اُن کے گھر چلا گیا وہیں پر علی رضا آ گئے جو کہ بہت اچھے مزاح نگار ہیں، میرا دوست بھی آ گیا، جاوید اقبال ہمیں کھانا کھلانے کیلئے جم خانہ لاہور لے گئے وہاں سے کھانا کھانے کے بعد سیدھے ہم لوگ فلم سٹار بابر علی کے پاس پہنچے پھر کافی دیر تک ہم لوگ وہاں بیٹھے رہے اور رات دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ خوش گپیوں میں مشغول رہے پھر ہم نے جاوید اقبال کو اُن کے گھر چھوڑا اور ہوٹل آ کر لیٹ گئے۔ میں نے جیب میں سے موبائل نکالا تو اُس پر ایک ایس ایم ایس ریسیو ہوا تھا جو کہ خرم رؤف نے اسلام آباد سے کیا تھا۔

خرم رؤف میرا آفس کولیگ ہے ایس ایم ایس میں لکھا تھا کہ احتشام صاحب کا انتقال ہو گیا ہے اور اُن کا نماز جنازہ رات 8 بجے H-11 قبرستان میں پڑھایا جائے گا۔ مجھے شدید دھچکا لگا کیونکہ احتشام صاحب بھی میرے آفس کولیگ تھے اور آفس کی مسجد میں نماز پڑھایا کرتے تھے۔ ابھی ایک دن پہلے جب میں نے اُن کے پیچھے نماز عصر پڑھی تو انہوں نے جماعت کھڑی ہونے سے پہلے اعلان کیا کہ سوموار 09 اکتوبر 2017ء کو نماز عصر 3 بج کر 30 منٹ پر ادا کی جائے گی میرے کانوں میں ابھی تک یہ الفاظ گونج رہے تھے۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ انسان کتنا بے بس ہے ابھی تو گزرے کل انہوں نے یہ اعلان کیا تھا اور آج ہفتے کے دن وہ قبر میں جا کر سو گئے اِس پر مجھے یاد آیا کہ ''سامان سو برس کا پل کی خبر نہیں۔''

احتشام صاحب پیشے کے لحاظ سے ڈپٹی چیف تھے جب وہ امامت کیا کرتے تھے تو نہایت اطمینان اور سکون کے ساتھ ظہر کے 4 فرض اور عصر کے 4 فرض ہم اُن کے پیچھے ادا کیا کرتے تھے۔ وہ تقریباً 10 منٹ لگایا کرتے تھے چار فرض مکمل کرنے میں اور ہم لوگ پیچھے کھڑے سوچ میں پڑ جاتے تھے کہ احتشام صاحب اتنا ٹائم کیوں لگاتے ہیں جلدی کیوں نہیں کرتے کبھی کبھی دفتری مصروفیات کے باعث وہ نماز میں شریک نہیں ہوا کرتے تھے تو اُس دن چیمہ صاحب امامت کیا کرتے تھے اور وہ تقریباً 7 منٹ میں نماز مکمل کروا دیا کرتے تھے ہم اُس دن بہت خوش ہوا کرتے

تھے۔ جب مجھے یہ ایس ایم ایس ملا تو مجھے احتشام صاحب سے دلی عقیدت جو کے پہلے بھی تھی اُس میں مزید اضافہ ہو گیا۔

اس سارے واقعے کو سنانے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ جب 9 اکتوبر کو ہم لوگ ظہر کی نماز کیلئے آفس کی مسجد میں اکٹھے ہوئے تو احتشام صاحب ہمارے ساتھ نہیں تھے ہم سب افسردہ تھے، رنجیدہ تھے اُن کے یوں اچانک چلے جانے پر دنیا سے بیزاری اور ناپسندیدگی کا احساس بڑھ گیا۔ میں ابھی تک اُس بند گلی میں کھڑا ہوں جسے زندگی کہتے ہیں جس میں انسان ایک دفعہ داخل جب ہوتا ہے تو پھر اُس کے پاس کوئی اور راستہ نہیں ہوتا اُسے موت کی وادی میں جانا پڑتا ہے بھلے وہ دل سے تیار نہ ہو۔ ہم سب نے ایک دن اپنی اپنی باری پر اس دنیا کو چھوڑنا ہے بلکہ چھوڑنا نہیں چھڑوایا جانا ہے کیونکہ ہم لوگ دنیا کی چنگل میں اس طرح سے پھنس چکے ہیں کہ مرنے کو تیار ہی نہیں ہیں، ہمارا دل ودماغ یہ ماننے کو تیار نہیں کہ ہم نے بھی مرنا ہے۔

میں ابھی تک اپنے آپ کو بند گلی میں محسوس کرتا ہوں کہ نا جانے کس وقت ہماری باری آجائے اور لوگ ایک دوسرے سے کہہ رہے ہوں کہ امین کنجاہی کا جنازہ رات 8 بجے فلاں قبرستان میں ادا کیا جائے گا۔

بچے

روزانہ صبح آفس جاتا ہوں تو راستے میں کوڑے کے ڈھیروں کے قریب مجھے سات آٹھ سال کے بچے بچیاں نظر آتے ہیں جن کے پاؤں میں جوتے بھی نہیں ہوتے اور وہ بچے اُس کوڑے میں سے پلاسٹک کے ٹکڑے نکال رہے ہوتے ہیں۔ کوئی لوہے کا ٹکڑا، کوئی بوتلوں کے ٹن، کوئی چپس کے پھٹے لفافے اکٹھے کر رہا ہوتا ہے۔

آج جب میں روٹین کے مطابق گھر سے نکلا تو راستے میں دیکھا ایک بچی گند کے ڈھیر میں سے چیزیں نکال رہی ہے اور ایک بچی اُس کے پاس کھڑی برینڈڈ چپس کے لفافے کو چاٹ رہی ہے مجھے یہ دیکھ کر بڑا ترس آیا اور میں سوچ میں پڑ گیا کہ یا اللہ! ان بچوں کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں کہ آلو کا ایک لفافہ خرید سکیں؟ اتنے میں سین بدل چکا تھا میں کافی آگے نکل آیا تھا مگر وہ بچی ابھی تک میرا پیچھا کر رہی ہے وہ بھی تو کسی کی اولاد ہے اُس کے پاؤں میں جوتے نہیں تھے پھٹے کپڑے پہنے ہوئے تھے سروں میں مٹی پڑی تھی اور وہ بڑی بے پرواہی کے ساتھ کچرے کے ڈھیر سے اپنے لئے دن کی روٹی کمانے کا بندوبست کر رہی تھی۔

ایسے پیارے پیارے چہروں والے بچے جنھیں اس عمر میں یا تو گھر کے اندر رہنا چاہیے یہ پھر اچھے یونیفارم پہن کر سکولوں میں پڑھنے کیلئے جانا چاہیے مگر وہ اس سب سے بے پرواہ اپنی دھن میں مگن سردی ہو یا گرمی، کچرے کے ڈھیروں پر سے مختلف چیزیں چھانٹ چھانٹ کر علیحدہ کرتے اور اپنے کام کی چیزیں اپنے تھیلے میں ڈالتے جاتے اِس طرح سے وہ اپنے اور اپنے گھر والوں کے

لئے روزی روٹی کماتے ہیں۔ اُسی کچرے کے ڈھیر کے پاس کتے بلیاں بھی ہوتے ہیں، کبھی آپ نے غور کیا کہ ہم اپنے بچوں کو ایسا کرنے دیں، نہیں کبھی نہیں۔ یہ بھی تو کسی کے بچے ہیں کسی کے لخت جگر ہیں کیا سردیوں میں انھیں ٹھنڈ نہیں لگتی انکے پاؤں بھی ننگے ہوتے ہیں کیا انھیں نمونیا یا شدید بخار نہیں ہوتا؟

ہم اپنے بچوں کو سردیوں میں گرم کپڑوں میں لپیٹ کر رکھتے ہیں اُس کے باوجود بھی ہمارے بچے بیمار ہو جاتے ہیں اِسی طرح گرمی میں، ہم اپنے بچوں کو پنکھوں، ائیر کولرز اور اے سی کے نیچے رکھتے ہیں کہ گرمی نہ لگ جائے۔ کیا کسی این جی او، سرکاری محکمے، نیم سرکاری ادارے یا کسی مخیّر شخص نے کبھی یہ سوچا کہ ایسے بچوں کیلئے خاص طور پر کام کیا جائے جو اِن بچوں کو ایسا کرنے سے روک سکے اور یہ بچے اچھے طریقے سے اپنے ماں باپ کیلئے بڑے ہو کر کارآمد شہری بن سکیں۔

ایسے بچوں کو سکولوں میں اور اچھے سکولوں میں فری داخلہ ملنا چاہیے اُن کی فیس کم سے کم ہونی چاہیے تاکہ یہ بچے تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو سکیں اور ملک اور قوم کی خدمت کرنے کیساتھ ساتھ اپنے گھر والوں کیلئے بھی باعزت رزق کمانے کا ذریعہ بن سکیں۔ اِن لوگوں کے بارے میں ہمیں کچھ سوچنا پڑے گا۔ ایسے غریب خاندانوں تک شادی بیاہ کی تقریبات میں بچا کھانا، ضرورت سے زائد کپڑے جو گھروں میں ہوتے ہیں پہنچانے کا سلسلہ شروع ہونا چاہیے تاکہ جو لوگ غربت کی سب سے نچلی سطح پر زندگی بسر کر رہے ہیں اُن کیلئے تھوڑی آسانیاں پیدا کی جا سکیں۔ ایسا کرنے کیلئے ہمیں حکومت وقت کی مدد کی زیادہ ضرورت نہیں پیش آئے گی کیونکہ ہمارے مخیّر افراد کے پاس اتنے وسائل ہیں کہ اگر قطرہ قطرہ جمع کیا جائے تو دریا بن جائیگا۔

آیئے ہم لوگ سر جوڑ کر بیٹھیں اور ان معصوم بچوں کیلئے جو میرے اور آپ سب کے اپنے ہیں اُن کی بھلائی کیلئے ایسے اقدامات کریں جو کہ اُن کی زندگیاں آسان بنا سکیں۔

دل

اچانک بیٹھے ہوئے دل کے بارے میں، میں سوچنے لگا اور سوچتا ہی چلا گیا۔ دل ویسے تو انسانی جسم کے ایک حصے کا نام ہے جس کا کام پمپ کی طرح ہے اور جس کے چار خانے ہیں اِن چار خانوں میں 2 خانے دورانِ خون بدن کے اندر صفائی کرنے کا کام کرتے ہیں اور 2 خانے بدن کے اندر خون سپلائی کرتے ہیں جس سے پورے بدن کا نظام اور دوران خون چلتا ہے۔ ایک اور سوچ اور احساس جو کہ انسان کے اندر پیدا ہوتا ہے بھلے وہ اچھا ہو یا بُرا ہو مگر انسان کہتا ہے یہ میرے دل کی مرضی ہے، میرا دل یوں چاہتا ہے، میرا دل یہ کرنے کو چاہتا ہے، میرا دل وہ کرنے کو چاہتا ہے۔ یہ ایک عجیب احساس ہے گو کہ انسان کے جتنے بھی فیصلے ہوتے ہیں جو کہ اُس کی زندگی اور اُس کے دوستوں رشتہ داروں اور احباب سب کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں اُن سب کو عملی جامہ پہنانے کا کام اصل میں ذہن کی طرف سے حکم ملنے پر ہر انسان کرتا ہے۔

کبھی کبھی میں حیران ہوتا ہوں کہ زندگی میں انسانی سوچ کا جو سب سے بڑا جذباتی تعلق بنتا ہے وہ دل کے ساتھ بنتا ہے انسان جب اپنے کسی پیارے کے ساتھ محبت کا اظہار کرتا ہے تو اُس کو کہتا ہے میرا آپ پر دل آگیا ہے اور میرا دل چاہتا ہے کہ ہم اکٹھے رہیں اور دنیاوی طور پر زندگی گزاریں دل محبت کی علامت بن جاتا ہے دل عشق کی علامت بن جاتا ہے دل جذبات کا بادشاہ بن جاتا ہے اور اپنے چھوٹے چھوٹے جذباتی رویوں کو انسان محبت کا نام دیتا ہے۔ وہ محبت بھلے کسی خوبصورت لڑکی کے ساتھ ہو عشق مجازی کی صورت میں یا پھر اپنے رب کے ساتھ ہو عشق حقیقی کی صورت میں۔ ہر حال میں دل محبت کا مرکز ہوتا ہے گو کہ دل کا ظاہری کام دھڑکنا ہے اور دھڑکن کے ذریعے سے انسانی جسم کو توانا اور رواں دواں رکھنا ہے۔ کبھی کبھی مجھے دل انسانی جسم میں ایک گھڑی کے مانند لگتا ہے جس کی آواز 24 گھنٹے دھک دھک آتی رہتی ہے اور یہ گھڑی چلتی رہتی ہے۔ اُس وقت تک جب تک کے موت کا الارم نہ بج جائے جب وہ بج جاتا ہے تو پھر دل ٹھہر جاتا ہے دھڑکن

رُک جاتی ہے بدن پتھر ہو جاتا ہے اور اُس بدن کو اہلِ خانہ اُٹھا کر زمین کے سپرد کر آتے ہیں۔
بات آپ سے دل کی کر رہا ہوں اور میرا دل کہتا ہے کہ دل اصل میں عشق کی علامت ہے اور ذہن خرد کا حامی ہے جو کہ دلیلوں میں پڑ جاتا ہے اور انسان کو قدم قدم پر ڈراتا رہتا ہے کہ یوں نہیں کرنا ایسے نہیں کرنا ویسے نہیں کرنا۔ ایسا کرو گے تو نقصان ہو جائے گا ایسا کرو گے تو پکڑے جاؤ گے اور بے شمار ڈرانے والے اور انسان کو بزدل بنانے والے خیالات ذہن اور عقل دیتی رہتی ہے۔ مگر دل جو کہ عشق کی نمائندگی کرتا ہے وہ ان سب چیزوں سے ماورا ہے ایک ایسے دوست کی مانند جو بے لوث ہوتا ہے جسے کوئی غرض نہیں ہوتی اُس کے اندر خود غرضی نہیں ہوتی، انسان کو جہاں کہیں بھی عشق کا معاملہ آتا ہے وہ اُس کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے اُسے ہمت دلاتا ہے بہادر بناتا ہے۔
یہی دل ہے جو عشق کے حوالے سے کبھی منصور بنتا ہے کبھی بہلول بنتا ہے کبھی شمس بنتا ہے کبھی غازی علم دین بنتا ہے کبھی حضرت ابراہیمؑ بنتا ہے جو کہ نمرود کی آگ کے سامنے کھڑا ہو جاتے ہیں اور نمرود یہ سمجھتا ہے کیونکہ وہ عقل کو ماننے والوں میں سے ہوتا ہے اُس کا خیال ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نمرود کی لگائی آگ میں جل کر خاکستر ہو جائیں گے مگر یہ عشق ہی ہوتا ہے جس کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے کہا کہ

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

یہ وہ دل ہے اور عشق ہے جو کہ حضرت یعقوبؑ کو حضرت یوسفؑ کے کُرتے کی خوشبو سے آنکھوں کی بینائی لوٹا دیتا ہے یہ وہ عشق ہے کہ جس نے حضرت اسماعیلؑ کو آدابِ فرزندی سکھائے۔ اِس عشق نے جو کہ دل سے شروع ہوتا ہے دل عشق کا امام ہے اور تمام دنیا کے عاشقان جو بھلے عشق مجازی کرتے ہوں یا عشق حقیقی کرتے ہوں وہ سب کے سب اِسی امام کے پیچھے ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ دل اور دماغ کے درمیان جو جنگ جاری ہے وہ دراصل عشق اور عقل کی جنگ ہے عقل دلیلیں مانگتی ہے مگر عشق کوئی دلیل نہیں مانگتا وہ صرف اور صرف دل کی بات مانتا ہے۔

لائل پور کا سفر

گزشتہ ہفتہ مجھے لائل پور جانے کا اتفاق ہوا میرا ایک کزن ہے وہ جب بھی ملتا مجھے گلا کرتا کہ امین تم لائل پور کیوں نہیں آتے؟ میں انہیں ہمیشہ آنے کا وعدہ کر کے بھول جاتا۔ میرے اس کزن کا رشتہ کچھ ایسا ہے میرے ساتھ کہ سال میں مجھے کئی دفعہ ان سے ملنا پڑتا ہے کبھی کنجاہ میں، کبھی گجرات میں، کبھی پنڈی میں اور ہر دفعہ وہ مجھے شرمندہ بھی کرتا اور پھر آنے کا وعدہ بھی لیتا۔ میں ہر دفعہ اُسے بڑی ہی ایمانداری سے کہتا کہ نہیں جاوید بھائی اس دفعہ ضرور آؤں گا وعدہ رہا اور پھر میں اُن سے روٹ کا پوچھتا کہ جاوید بھائی آگر راولپنڈی موٹروے سے آؤں تو کتنے گھنٹے لگ جائیں گے تو وہ مجھے بڑے سنجیدہ ہو کر سمجھانے لگتے کہ تم فلاں گاڑی میں بیٹھو فیض آباد سے تو وہ تقریباً ساڑھے چار پانچ گھنٹے لے گی اور براستہ پنڈی بھٹیاں وہ تمھیں لائل پور کے سجان والا بس اڈے پر اُتار دے گی اور جب تم لائل پور کے ٹول پلازہ کے قریب پہنچو تو مجھے فون کر دینا میرا بیٹا تمھیں اڈے سے لینے آجائے گا۔

ویسے بھی میری لائل پور اور سمندری کے ساتھ بہت سی یادیں وابستہ ہیں یہ یادیں کوئی 51 برس پرانی ہیں۔ اپنی یادداشت کی ڈائری ماضی کے پردوں پر آن کرتا ہوں تو وہ لمحے جو میں نے سمندری میں گزارے یاد آجاتے جب میرے بابا وہاں کام کیا کرتے تھے اُس کے بعد ہم لوگ گجرات کنجاہ اور پھر راولپنڈی آ کر آباد ہو گئے۔ میرا لائل پور اور سمندری کے ساتھ روحانی رشتہ ہے، تھا اور رہے گا۔ اس دفعہ اچانک مجھے میرے دوست مقصود وفا نے لائل پور سے فون کیا اور کہا امین یار لائل پور کا پروگرام ہے اگر تیرا تو آجا کیونکہ جمعے کی رات 12 بجے سے لے کر 2 بجے تک مقصود وفا لائل پور سے ایک ایف ایم ریڈیو پر لائیو ریڈیو شو کرتا ہے اور اُس میں وہ کبھی کبھی کسی شاعر یا شاعرہ کو مدعو کرتا

ہے۔اُس نے مجھے اتنے پیار سے کہا کہ میں انکار نہ کرسکا جمعے کو راولپنڈی سے نکلا کزن کے بتائے ہوئے بس کے اڈے پر پہنچا وہاں سے ساڑھے سات سو کا ٹکٹ لیا اور لائل پور کیلئے روانہ ہو گیا۔

زندگی میں مجھے سفر کرنا کبھی بھی پسند نہیں ہوا بھلے وہ سفر اُردو کا ہو یا انگریزی کا۔ مجبوراً مجھے یہ پانچ گھنٹے سفر کرنا پڑا، میں لائل پور کے سبحان والے اڈے پر پہنچ گیا اور ٹول پلازہ سے کزن کو فون پر بتا دیا کہ لائل پور میں داخل ہو رہا ہوں، مجھے اڈے پر پہنچ کر اپنے کزن کا انتظار نہیں کرنا پڑا کیونکہ وہ پہلے سے ہی وہاں رکشے والے سے بات کر چکا تھا۔ ہم دونوں رکشے پر بیٹھ کر گھر چلے گئے راستے میں جاتے ہوئے میں نے دیکھا کہ لائل پور کی سڑکیں بہت وسیع ہیں حالانکہ لائل پور پاکستان کا آبادی کے لحاظ سے تیسرا بڑا شہر ہے اِس کے باوجود وہاں ٹریفک کا ہجوم، گھٹن اور رکاوٹیں نظر نہیں آئیں بہت سکون سے گھر پہنچے۔ میرا کزن بہت خوش تھا کہ میں نے اُس کی بات مانی اور لائل پور آگیا، ایک دو گھنٹہ آرام کرنے کے بعد میں نے اپنے کزن جس کا نام جاوید ہے سے کہا کہ یار تیرا چھوٹا بیٹا کدھر ہے اُس کو کہنا مجھے رات 11 بجے ریڈیو پر جانا ہے 12 بجے ریڈیو پر لائیو پروگرام کرنا ہے راستہ مجھے نہیں معلوم وہ وہاں تک لے جائے جاوید نے کہا کوئی بات نہیں تو بے فکر ہو جا کھانا کھا میں آصف کو کہہ دیتا ہوں وہ تجھے لے جائے گا۔

چونکہ میرے اندر بے چینی اور جلد بازی تو ہے ہی جس کی وجہ سے میں نے آصف کو کہا بھائی مجھے وہاں تک لے جا جہاں کا ایڈریس بتایا تھا۔ سوا گیارہ بجے وہاں پہنچے، مقامی کام کرنے والوں کو اُٹھایا اُس وقت وہ سو رہے تھے انھیں بتایا کہ مقصود وفا نے بلایا ہے تو کیا وہ ریڈیو اسٹیشن آچکے ہیں؟ انھوں نے کہا آپ بیٹھیں وہ تھوڑی دیر میں پہنچنے والے ہیں ہم سٹوڈیو میں ایک انتظار گاہ میں بیٹھ گئے اتنے میں مقصود وفا آگیا وہ یاروں کا یار ہے مجھے بہت عزیز ہے۔اُس نے مجھ سے کہا کہ بچوں نے کوئی چائے پانی پوچھا تو میں نے کہا سب کچھ ہو گیا تو آگیا ہے تو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے بس ایک سگریٹ پلا وہ بھی سادہ۔ وہ ہنسا اور کہنے لگا میرے پاس سادہ ہی ہوتا ہے پھر میں نے پروگرام کے بارے میں بات کی کہ کیا پیش کرنا ہے کیا طریقہ کار ہے اُس نے بتا دیا کہ میں تجھ سے سوالات کروں گا لائیو اور تو نے اُن کے جوابات دینے ہیں سوالات میں کچھ ذاتی نوعیت کے ہوں

گے، کچھ ادبی لحاظ سے ہوں گے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ اُس نے کہا کے مجھے اپنی پسند کے گانے بتا دے تاکہ میں کیوشیٹ تیار کرلوں۔ میں نے اپنی پسند کے چند نغمے اُن کو لکھوا دیئے اُس میں ایک پہلا گانا تھا ''تُو میری زندگی ہے'' تصور خانم کا گایا ہوا۔

انٹرویو کا جو 12 بجے شروع ہوا تقریباً سوا دو بجے تک چلتا رہا آپ یقین مانئے کہ میری زندگی کا بہت شاندار تجربہ رہا میں نے بغیر کسی خوف کے اپنی زندگی اور ادبی مصروفیات کے بارے میں کھل کر بات کی۔ پورے پروگرام میں ہم صرف دو نغمے شامل کر سکے، پروگرام کے دوران ٹیلی فون کالز آتی رہیں میسجز آتے رہے لندن، امریکہ اور مختلف شہروں سے۔ بہت اچھا لگا میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ میں پہلے لائل پور کیوں نہیں آسکا۔

جب پروگرام ختم ہوا تو مقصود وفا کا شکریہ ادا کیا، وہ کہہ رہا تھا کہ امین یار بیٹھ کچھ گپ لگاتے ہیں میں نے اُسے کہا یار اب رات کے 3 بجنے والے ہیں گپ کا ٹائم پھر کسی اور دن پر اُٹھا رکھتے ہیں ابھی مجھے اجازت دے پھر اُس نے کہا کہ رات کافی ہو چکی ہے تو اکیلا بچے کے ساتھ مت جا میں اپنی گاڑی میں چھوڑ آتا ہوں کیونکہ لائل پور کے حالات کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔

پھر وہ مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر لائل پور کے محلے امین ٹاؤن میں اُتار کر چلا گیا اُس وقت تک وہ باہر کھڑا رہا جب تک کہ میں گھر کے اندر داخل نہیں ہوا۔

دن مہینے سال

زندگی نہایت خاموشی کے ساتھ پُرسکون دریا کی مانند گزرتی چلی جارہی ہے جو اپنے راستے خود متعین کرتی ہے وقت اور پانی کے بہاؤ کی طرح بہتی چلی جارہی ہے۔ جس نے آخر میں بہت بڑے موت کے سمندر میں جا کر گرنا ہے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے یہ کیسی باتیں کر رہا ہے جی میں بالکل صحیح اور سچی باتیں کر رہا ہوں ہر عروج کو زوال ہے ہر اونچائی کے بعد ڈھلان شروع ہوتی ہے، ہر بلندی کے بعد پستی ہے۔ زندگی 3 حصوں میں چلتی ہے پہلا حصہ بچپن، دوسرا جوانی تیسرا بڑھاپا ہے یہ 3 ادوار ہر انسان کو جو اِس دنیا میں آیا ہے اور اگر اُسکی عمر 50 سال سے اوپر چلی جاتی ہے تو اُس کو یہ تینوں دور دیکھنے نصیب ہو جاتے ہیں۔ وقت مٹھی میں ریت کی طرح سے نکل رہا ہے بے شمار قوموں کو عروج ملا پھر وہ زوال پذیر ہوگئیں یہی حال آج کے دور میں چل رہا ہے بعض اقوام بہت زیادہ ترقی کر چکی ہیں زندگی کے ہر شعبے میں وہ اپنے عروج کو چھو رہی ہیں بعض قومیں ابھی درمیان میں ہیں اس خواہش اور تگ و دو میں ہیں کہ وہ بھی عروج حاصل کریں بعض ابھی بہت نچلی سطح پر ہیں مگر اُن کے اندر بھی ترقی اور عروج حاصل کرنے کا شوق اور خواہش موجود ہے۔

میرے آج کے کالم کا موضوع بھی کچھ ایسا ہی ہے جیسے دن مہینے اور سال یہ 3 دور بنتے ہیں ایک ہفتے میں 7 دن ہوتے ہیں ایک مہینے میں 4 ہفتے ہوتے ہیں اور ایک سال میں 52 ہفتے اور 12 ماہ ہوتے ہیں۔ آپ کبھی غور کریں میرے ساتھ تو ہمیشہ سے ہی مسئلہ رہا ہے کہ جب سوموار کا دن شروع ہوتا ہے تو مجھے انتہائی مشکل لگتا ہے کہ یہ 6 دن کیسے گزریں گے مگر جب جمعے تک پہنچتا ہوں تو دل میں خوشی کی ہلکی سی لہر اُٹھتی ہے کہ اب ہفتہ ختم ہونے والا ہے چھٹی آئے گی مزہ آئے گا۔ جب ہفتہ اتوار گزر جاتے ہیں تو میں نئے سرے سے خود کو بڑا دُکھی محسوس کرتا ہوں کہ یار ابھی تو سوموار آیا تھا آج پھر سوموار آ گیا ہے بعض اداروں میں ایسی سوچ کو ایم ایم ڈی Monday Mental Deases بھی کہا جاتا ہے اِس طرح دن ہفتوں میں تبدیل ہوتے ہیں اور ہفتے مہینوں میں اور مہینے سالوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ بچے جوان ہو جاتے ہیں جوان بوڑھے

ہو جاتے ہیں بوڑھے مر جاتے ہیں مگر یہ کوئی مشروط نہیں کہ بوڑھے پہلے مریں گے اور بچے آخر میں مریں گے یا بچے پہلے مریں گے اور بوڑھے آخر میں مریں گے۔ یہ صرف اور صرف رب ہی جانتا ہے کہ کس نے کیسے اور کب مرنا ہے مگر یہ طے ہے کہ سب نے مرنا ہے زندگی کا دریا اسی طرح رواں دواں رہے گا اور اُس میں بے شمار پانی آتا رہے گا اور قومیں ملک عروج و زوال حاصل کرتی رہیں گی نا جانے یہ سلسلہ کب سے ہے اور کب تک رہے گا۔

نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فرمایا ہے یوم حشر بہت جلد آئے گا اُس دن ہر شخص سے حساب لیا جائے گا کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی جائے گی کسی گورے کو کالے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہوگی کسی عربی کو عجمی پر کوئی فوقیت نہیں دی جائے گی کسی امیر کو غریب پر ترجیح نہیں دی جائے گی اگر کوئی فوقیت کوئی فضیلت کوئی ترجیح دی جائے گی تو وہ صرف اور صرف اعمال پر دی جائے گی جس انسان کے اعمال اچھے ہوں گے اُس کو جنت کیلئے منتخب کر لیا جائے گا اور جن لوگوں کے اعمال بُرے ہوں گے اُن کو دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔ اللہ نے جو کہ 70 ماؤں سے زیادہ انسان سے پیار کرتا ہے وہ کسی صورت نہیں چاہے گا کہ اُس کا بنایا ہوا انسان دوزخ کی آگ میں جلے مگر وہ لوگ جو ابلیس کا راستہ اختیار کریں گے اور اپنی طاقت کا غلط استعمال کریں گے حقوق اللہ اور حقوق العباد کا خیال نہیں رکھیں گے ایسے لوگوں کو جہنم کی آگ کا ایندھن ضرور بنایا جائے گا اُن کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتی جائے گی۔

دن مہینے سال گزرتے جا رہے ہیں ابھی مخلوق خدا کے پاس وقت ہے کہ سدھر جائے دین فطرت پر واپس آجائے ایسا نہ کر سکے تو کھلی گمراہی میں چلے جائیں گے، بخشش کے سب دروازے بند کر دیئے جائیں گے۔ آیئے سب مل کر ایک دوسرے کا خیال کریں، محبت کریں، درگزر کریں ایک دوسرے کی غلطیوں کو معاف کریں۔ بڑوں سے کوئی کام غلط ہو گیا ہے تو چھوٹوں سے معافی مانگ لیں اور اگر چھوٹوں سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہے تو بڑوں سے معافی مانگ لیں غصے کا جھگڑے کا راستہ اختیار نہ کریں اپنے اندر برداشت پیدا کریں تنگدستی میں خوشحال رہنے کا طریقہ سیکھیں خوشحالی میں تنگ دستوں کی مدد کریں تا کہ ہمارے دن مہینے اور سال اچھے سے بسر ہو سکیں۔

دوغلا پن

آپ لوگوں سے زندگی کی چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کو شیئر کرتا آیا ہوں، آپ لوگوں نے اکثر یہ محسوس کیا ہوگا کہ میں جو بات اپنے کالموں میں لکھتا ہوں اُس کا مقصد صرف اتنا ہے کہ جب آپ میرے کالموں کو پڑھیں تو یہ محسوس کریں کہ گویا یہ اُن کے دل میں تھا۔ اسی طرح آج جو بات آپ کے ساتھ کرنی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ جو کہ مکمل طور پر مسلم معاشرہ ہے اور جس میں اکثریت میں مسلمان آباد ہیں، ہمارے دین اور ہمارے پیارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ تعلیمات دی ہیں کہ اپنے قول وفعل میں تضاد مت پیدا کرو۔

جو آپ بظاہر نظر آتے ہیں آپ کو باطنی طور پر بھی ویسا ہی ہونا چاہیے، اپنے پیاروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آیا جائے، دشمن کو برداشت کیا جائے اُس کی غلطیوں کو درگزر کیا جائے، لین دین ناپ تول میں بے ایمانی نہ کی جائے۔ آپ کے مال میں جو کہ آپ بازار میں لے کر بیچنے کیلئے آتے ہیں اُس میں اگر کوئی عیب، نقص یا خرابی ہے تو خریدار کو سب سے پہلے بتادیں تاکہ جب وہ مال خرید کر گھر لے جائے تو آپ کو بُرا بھلا نہ کہے۔ یہ کردار معاشرے میں ہم سب کا ہونا چاہیے مگر نہایت افسوس سے لکھنا پڑ رہا ہے کہ جتنی بھی ہماری اخلاقی اقدار ہیں وہ تمام کی تمام غیر مسلموں نے اپنالی ہیں۔

آپ میں سے اکثر لوگوں نے بیرونِ ملک سفر کیا ہوگا وہاں یہود ونصاریٰ کے ساتھ لین دین کیا ہوگا

اُن کے بازاروں میں گئے ہوں گے خرید و فروخت کی ہوگی، پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر کیا ہوگا پیدل راستوں پر چہل قدمی کی ہوگی۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ اُن کے نظام میں ہر چیز انتہائی ایمانداری اور سچ کے ساتھ پیش کی جاتی ہے اُن کے اندر اور اُن کے معاشرے کے اندر دوغلا پن نہیں ہے اگر وہ کوئی غیر اخلاقی کام کرتے ہیں تو اُس کو مان لیتے ہیں اور اگر کوئی سیاسی یا معاشی طور پر غلط اقدام اُٹھاتے ہیں جس سے اُن کے ملکی حالات پر اثر پڑتا ہے یا عام آدمی متاثر ہوتا ہے تو وہ فوراً یا تو مستعفی ہو جاتے ہیں یا اپنی قوم سے معافی مانگ لیتے ہیں مگر ہمارے ملک اور معاشرے میں بالکل اُلٹا نظام ہے یہاں پر جو امیر ہے وہ امیر تر ہے جو غریب ہے وہ غریب تر ہے۔ ہمارے لین دین میں دھوکے بازی ہے، قول و فعل میں تضاد ہے، رشتہ داریوں میں منافقت ہے۔

غور سے دیکھا جائے اور پرکھا جائے تو مجھے ایسے لگتا ہے کہ جتنی بھی بُری اقوام کے بارے میں قصے اور واقعات ملتے ہیں وہ سب کی سب بُرائیاں ہمارے معاشرے میں سرائیت کر چکی ہیں جس کی وجہ سے ہم لوگوں کے اندر نہ خوف خدا ہے نہ ایمانداری۔ صرف اور صرف لالچ، حرص، خود غرضی اور اپنے سے بہتر کو بُرا تصور کرنا اور اپنے سے چھوٹے کو آگے بڑھنے سے روکنا یہ ہمارے نظام کا خاصا بن چکا ہے۔ جس کی وجہ سے ہر مکتبہ فکر میں دوغلا پن آ چکا ہے، ہم لوگ بری طرح سے ذلتوں میں گھرتے چلے جا رہے ہیں۔

آیئے عہد کریں ہم لوگوں نے اپنے اندر سے دوغلے پن کی بیماری کو ختم کرنا ہے، اپنے اعمال اور اپنی روزمرہ کی زندگی میں بھی ایک رنگ، ایک قوم، ایک کتاب، ایک کلمہ، ایک نبیؐ اور ایک اللہ پر ایمان رکھیں، ایک اللہ کے احکامات پر عمل کریں اور اپنی دنیا و آخرت سنوار لیں۔

-

عیدی

بچپن میں جب عید آیا کرتی تھی تو رمضان کے 30 یا 29 دن ہمیں بہت بھاری لگا کرتے تھے کیونکہ وہ عمر تھی جب ہم کبھی کبھی روزہ رکھتے تھے۔ دن میں پیاس کی شدت تنگ کرتی تھی تو گھر کے صحن میں لگے نلکے سے چپ چاپ پانی پی لیا کرتے تھے اور کسی کو پتا بھی نہیں چلتا تھا منہ کو اپنے بازوؤں کے ساتھ صاف کرلیا کرتے تھے پھر افطاری کے وقت بڑے اہتمام کے ساتھ افطاری کیا کرتے تھے۔ بڑے بہن بھائی اور ماں باپ بڑے پیار سے دیکھا کرتے تھے کہ ہمارے بچے نے روزہ رکھا ہے اس کو کھانے کیلئے زیادہ دو، شربت دو۔ شربت اُن دنوں سیون اپ پیپسی نہیں ہوا کرتے تھے بہت ہوا کرتا تو کسی کے گھر لال شربت مل جایا کرتا ویسے عام طور پر ہر گھر میں شکنجبین بنائی جاتی تھی اور شکنجبین بھی ایسی جس میں لیموں کے بیج بھی نہیں نکالے جاتے تھے پیتے ہوئے وہ بیج زبان پر رُک جایا کرتے اور شکنجبین حلق سے نیچے اُتر جایا کرتی تھی۔ پکوڑے بھی بہت کم یا نہ ہونے کے برابر بنائے جاتے تھے سحری کے وقت گھروں میں چائے پراٹھا یا رات کا بچا ہوا سالن کھایا جاتا تھا کوئی انڈہ فرائی یا آملیٹ کا تصور نہیں تھا ہاں گرمیوں میں دہی اور لسی ضرور بنائی اور پی جاتی تھی۔

بچپن کے دنوں میں سال میں دو دفعہ نئے کپڑوں کے جوڑے ملا کرتے تھے ایک چھوٹی عید پر جو کہ عید سعید کہلاتی ہے اور دوسری عید قرباں، پر یقین مانئے جب رمضان کا آخری عشرہ شروع ہوتا تو ہم والدین سے ضد کرنا شروع کر دیتے تھے کہ نئے کپڑے لا کر دیں بنوا کر دیں نئے جوتے نئی جرابیں بھی لینی ہیں۔ بہنیں چوڑیاں، مہندی اور بالوں پر کلپ لگوانے کے لئے ضد

کیا کرتی تھیں اُس دور میں کوئی برینڈ نہیں ہوا کرتے تھے سوائے باٹا اور سروس کے جوتوں کے یا چند پرائیویٹ ناقص قسم کی کمپنیاں ہوا کرتی تھیں جو کے سستے جوتے بنایا کرتی تھیں مگر نہ کپڑوں میں کوئی برینڈ ہوتا تھا نہ ہی بچوں کو کسی برینڈ کی خواہش ہوتی تھی یا پتا ہوتا تھا۔ گھروں میں کوئی ٹوتھ پیسٹ نہیں ہوا کرتی تھی دانتوں کیلئے کبھی کبھی منجن ضرور آجایا کرتا تھا، کوئی نمک سے دانت صاف کرلیا کرتا تھا، کوئی کوئلے سے۔

میں جو باتیں آپ کو بتا رہا ہوں کوئی صدیوں پرانے قصے نہیں ہیں یہ چند دہائیوں کے قصے ہیں جب ایک جی ٹی روڈ ہوا کرتی تھی کچھ پرائیویٹ بسوں کی کمپنیاں تھیں مگر لوگ جی ٹی ایس پر سفر کرنا محفوظ تصور کرتے تھے پھر ریل کار کا سفر اچھا اور آسان لگتا تھا۔ گجرات سے کنجاہ تک ہم لوگ تانگے پر آیا کرتے تھے کیونکہ اُن دنوں کوئی رکشہ، ٹیکسی، چنگچی یا ویگن نہیں ہوا کرتی تھی لاری ہوا کرتی تھی۔ بس نما لاریاں منڈی بہاؤالدین اور سرگودھا جایا کرتی تھیں کبھی کبھی ہم اُن بسوں پر بیٹھ کر قینچی سٹاپ پر اُتر جایا کرتے تھے مگر کرایہ پورا سرگودھا یا منڈی کا دیا کرتے تھے۔

بات عید کی کر رہا تھا اور بات دوسری طرف جانکلی، یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ ہمارے ماں باپ ہم تمام بہن بھائیوں کے واسطے اپنی پسند کے کپڑے پہلے خریدتے تھے پھر درزی سے سلواتے تھے۔ عید کی رات ہمیں نئے کپڑے اور نئے جوتے پکڑا دیئے جاتے تھے۔ آپ یقین مانئے ہم اتنا خوش ہوا کرتے تھے کہ خوشی کی کوئی انتہا نہیں ہوا کرتی تھی اپنے کپڑوں کو بار بار دیکھتے اور دل میں دُعا کرتے کہ جلدی عید کا دن آئے اور ہم نئے کپڑے نئے جوتے پہنیں۔ ہم اپنے نئے جوتوں کے ڈبوں اور نئے کپڑوں کو رات اپنے سرہانے رکھ کر سویا کرتے تھے کوئی فکر کوئی پریشانی نہیں ہوا کرتی تھی۔ صبح صبح اُٹھ کر ابھی گھر کے سارے افراد سوئے ہوتے تھے تو ہم پھر سے اپنے جوتوں اور کپڑوں کو دیکھتے تھے اتنے میں ہماری ماں اُٹھ کر فجر کی نماز ادا کرتی پھر سویاں اُبالنے کیلئے رکھ دیتیں۔ جب سویاں اُبل جاتیں تو اُن کو چھاننے میں پُن لیا کرتیں، تمام پانی نکل جانے کے بعد اُن کو ایک دیگچی میں رکھ دیتیں۔ ماں سویوں میں دودھ اور چینی ڈال کر ایک گلاس میں پانی اور ایک گلاس میں دودھ ڈال کر ٹرے میں رکھ کر والد کو دیتیں کہ آپ ان پر ختم پڑھ لیں۔ والد بیٹھ کر کچھ دیر

قرآنی آیات تلاوت کرتے دُعا کیلئے ہاتھ اُٹھاتے تمام خاندان کے مرحومین کیلئے، تمام انبیاءؑ، ولی اور مومنین کیلئے دُعا فرماتے پھر اُس کے بعد ہمیں کھانے کیلئے سویاں دی جاتیں سویاں بھی لمبی لمبی ہوا کرتی تھیں ہم بڑی مشکل سے کھایا کرتے۔ اُس کے بعد ہم جلدی سے نئے کپڑے اور جوتے پہن کر ابا اور اماں سے عیدی کا تقاضا کرتے۔

ہمیں ایک روپیہ عیدی ملتی ہم خوشی خوشی ایک روپیہ لے کر گلی میں بھاگ جاتے دوستوں کے پاس سارا دن بازار میں گلیوں میں گھومتے جھولے لیتے برف کے گولے کھاتے چینی کے لچھے لیتے چنا چاٹ کھاتے، شام تک ہمارا گلا بند ہو جاتا اور کھانسی لگ جاتی۔ اس دوران رشتہ دار ملنے آتے یا ہم اُن رشتہ داروں کے گھر جاتے تو وہ ہمیں عیدی دیا کرتے کوئی آٹھ آنے دیتا کوئی ایک روپیہ دیتا شام تک ہم وہ ساری عیدی ختم کر کے گھر لوٹتے۔

مگر آج کی عید بالکل مختلف ہوگئی ہے آج کی عید کیلئے ماں باپ کو قرضے لینے پڑتے ہیں کیونکہ بچے ہمارے دور کے چالاک ہو گئے ہیں سو پچاس میں راضی ہونے والے نہیں ہزاروں اور لاکھوں روپے کے شوقین ہیں کیونکہ آج کا دور مارکیٹنگ کا دور ہے ہر طرف اشتہارات ہیں برینڈز ہیں۔ آج کے دور کا ہر بچہ سر سے لے کر پاؤں تک اپنے آپ کو برینڈ ڈبنانا چاہتا ہے وہ عید نہیں گزارتے چلتا پھرتا اشتہار بننا چاہتے ہیں انہیں عید کی خوشیوں کا احساس نہیں ہے کہ عید کی خوشیاں کتنی پر مسرت اور کتنی نازک ہوتی ہیں۔

فرار

دو دن پہلے مجھے ایک جنازے میں جانے کا اتفاق ہوا جنازے کا وقت نماز عصر کے بعد رکھا گیا تھا مجھے رات کو ہی اِطلاع مل گئی تھی کہ علی اب ہم میں نہیں رہا وہ میرا بہت قریبی دوست راز دار اور نا جانے کیا کیا تھا۔ کچھ عرصے سے وہ حد سے زیادہ مصروف رہنے لگ پڑا تھا اُس سے جب کبھی فون پر بات کرنی چاہی تو اُس نے میرا فون کاٹ دیتا یا پھر بیل جاتی رہتی اور وہ اٹینڈ نہ کرتا۔ کبھی کبھی کوئی اچھا سا میسج واٹس ایپ پر آتا تو میں اُس سے شیئر کر دیتا مگر اُس کا بھی جواب نہیں دیتا تھا بظاہر ہم دونوں میں کبھی کوئی لڑائی، جھگڑا یا گلا شکوہ زندگی نہیں تھا اُس کی میری دوستی 30 برس سے زیادہ عرصے پر محیط رہی آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ وہ میرے فون یا میسج کا جواب نہ دے۔ پھر ایک دن اچانک ہم دونوں کا مشترکہ دوست مجھے ملا میں نے اُس سے علی کے بارے میں پوچھا تو اُس نے بتایا کہ علی ذہنی طور پر بہت زیادہ دباؤ میں ہے کسی سے نہیں ملتا آجکل اُس کے ذہن پر ایک ہی بھوت سوار ہے کہ میں نے بزنس کرنا ہے اور اُس میں کامیابی حاصل کرنی ہے جس کی وجہ سے اُس نے اکثر دوستوں کو نو لفٹ کا بورڈ لگا دیا ہے مگر مجھے یہ بات کچھ ہضم نہ ہوئی کیونکہ علی ایک ریٹائرڈ فوجی آفیسر تھا اُس کے اندر بے پناہ صلاحیتیں تھیں وہ ہر قسم کے موسم اور تکلیفوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ ظاہری طور پر ایک ہنس مکھ خوبصورت انسان اتنا سخت دل نہیں ہوسکتا۔

ایک دن اچانک میں نے اُسے دوسرے نمبر سے فون کیا جو اُس نے اُٹھالیا میں نے پوچھا علی کیا تم مجھ سے ناراض ہو، یا میری کوئی بات تمھیں بری لگی تم میرا فون کیوں نہیں اٹینڈ کرتے، میرے واٹس ایپ کا جواب کیوں نہیں دیتے تو اُس نے اپنے روایتی انداز میں بڑے پیار سے مجھے کہا نہیں بھائی صاحب کچھ بھی نہیں کوئی ایسی بات نہیں میں بس تھوڑا مصروف ہو گیا تھا۔ پھر میں نے اُسے تھوڑے سے ڈانٹ کے انداز میں کہا چل بکواس نہ کر اور یہ بتا کب ملنا ہے؟ تو اُس نے ہنستے ہوئے کہا بھائی جی اِس اتوار تو میں گاؤں جا رہا ہوں ایسا کرتے ہیں کہ اگلے اتوار ملتے ہیں۔ میں

نے فوراً اُس کی بات کاٹ کر کہا یار میں تیرے گھر آ جاؤں گا وہیں بیٹھ کر گپ شپ لگائیں گے کھانا کھائیں گے اور اگر کوئی مجھ سے دانستہ نادانستہ تیری شان میں کوئی گستاخی ہوگئی ہے تو میں وہاں آ کر باضابطہ تجھ سے اور بھابی سے معافی مانگ لوں گا۔

وہ ہنس پڑا، میں نے کہا آئندہ میرا فون اُٹھا لیا کرنا اُس نے کہا جی بھائی جی ضرور کوئی ایسی بات نہیں۔ یہ ساری باتیں آپ سے شیئر کرنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ زندگی بہت بڑا دھوکا ہے جس میں ہم جی رہے ہیں، علی مجھ سے عمر میں چھوٹا اور بہت لائق میں بالکل ایوریج والا ایسا طالب علم جو کہ کلاس میں ہمیشہ پچھلے بنچوں پر بیٹھنے والا تا کہ اُستاد کوئی سوال پوچھے تو اُس کی نظر مجھ پر نہ پڑے جب اُستاد کوئی سوال پوچھتا بھی تو میں اپنا سر اور نیچے کر لیتا تا کہ چھپ سکوں۔ 2 دن پہلے جب میں آفس سے گھر آیا تو تقریباً ساڑھے پانچ بجے مجھے فون آیا دوسری طرف رونے کی آواز آ رہی تھی اُس آواز سے صرف اتنا سمجھ آیا کہ ماموں آپ جلدی گاؤں آ جائیں بابا نہیں رہے۔ ایک لمحے کے لئے میں سکتہ میں آ گیا میں نے ڈانٹ کر بات کرنے والے کو کہا کیا بکواس کرتے ہو، کیا کہہ رہے ہو، تو اُس نے کہا ماموں میں علی کا بیٹا بول رہا ہوں بابا اس دنیا میں نہیں رہے۔ پھر نہ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک دم سے گاڑی سٹارٹ کی اور جی ٹی روڈ پر ڈال دی۔ جب میں علی کے گھر پہنچا تو پتا چلا کہ میت کو کولڈ سٹوریج میں رکھ دیا گیا ہے جنازہ اگلے دن شام میں چار بجے ادا کیا جائے گا۔ پھر وہ وقت بھی آ گیا جب علی کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ قبرستان میں علی کو پورے فوجی اعزاز کیساتھ دفنایا جا رہا تھا تو کچھ لوگ سگریٹ پی رہے تھے کچھ سیاست پر گفتگو کر رہے تھے کچھ اپنی گھریلو زندگی پر باتیں کر رہے تھے۔ اچانک مجھے خیال آیا کیا ہم لوگوں میں سوائے دنیاداری اور مادہ پرستی کے علاوہ کچھ بھی نہیں رہا ہمارے دلوں میں خوف خدا کب پیدا ہوگا؟ علی جیسا خوبصورت ہنس مکھ اور بھرپور زندگی گزارنے والا انسان اتنی جلدی اور اتنی بے بسی سے اِس دنیا سے چلا گیا۔ کون، کیسے اُس کے اور اُس جیسے بے شمار لوگوں کے دکھوں اور غموں کا ساتھی کب بنے گا تا کہ کوئی اور علی بھرے مجمعے کو تنہا کر کے نہ چلا جائے اللہ ہم سب کو ایسی مشکل گھڑی سے اپنی پناہ میں رکھے۔ آمین

گھر

بنی نوع انسان کو ہر دور میں اپنے گھر کی ضرورت رہی اس سلسلے میں بڑی بڑی عظیم قوموں نے اپنے اپنے دور میں انسانوں کیلئے گھر بنانا شروع کیے تا کہ لوگ آرام سے رہ سکیں۔ برصغیر پاک وہند میں سب سے قدیم ترین اور سول سوسائٹی کا شاندار نمونہ اگر ہمیں کہیں ملتا ہے تو وہ موہنجودڑو کی تاریخ میں ملتا ہے جہاں پر پہلی دفعہ اُس تہذیب کے لوگوں نے اپنے رہنے کیلئے مکمل گھر کا نظام قائم کیا جس میں نکاسی آب کیلئے نالیاں اور پکی اینٹوں کی تنگ گلیاں بھی بنائی گئیں۔ اسی دور کے آثار قدیمہ سے ہمیں پہلی دفعہ پتھر کے پہیے اور شطرنج کے کھیل کی گوٹیاں بھی ملیں، گندم کے دانے، کپاس کے آثار بھی اسی دور میں پائے گئے۔

انسانی ترقی کا جائزہ لیں یا خیال کریں تو گھروں کے بنانے کی ترکیب مسلسل تبدیل ہوتی رہی ہے گھر ایک ایسا ٹھکانہ ہے جس کی ضرورت ہر جاندار کو ہے بھلے وہ حیوانات میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔ آپ نے کبھی غور کیا ہوگا کہ صبح صادق کے وقت اکثر پرندے اپنے گھونسلوں سے غول در غول اُڑتے ہوئے روٹی روزی تلاش کرنے کیلئے نکل پڑتے ہیں جب شام ڈھلتی ہے تو یہی پرندے اُسی طرح دوبارہ غول در غول اپنے گھونسلوں میں آ کر رات بسر کرتے ہیں۔ یہی حال انسانوں کا بھی ہے آپ پوری دنیا کو دیکھ لیں صبح کا وقت ہوتا ہے تو تمام بنی نوع انسان اپنے اپنے گھروں سے نکلنا شروع کرتے ہیں بچے تعلیم حاصل کرنے کیلئے، بڑے فکر معاش کیلئے۔ یہ سلسلہ پوری دنیا میں اسی طرح سے چلتا ہے اور چل رہا ہے اور شاید چلتا رہے گا۔

میں بھی روزانہ اپنے کام کے سلسلے میں صبح 7 بجے گھر سے نکلتا ہوں چاندنی چوک کے قریب بہت بڑا پل بنا ہوا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ مری روڈ میں ٹریفک کا نظام بہتر طریقے سے چلتا رہے اس

پل کے اوپر سے میٹرو بس گزرتی ہے نیچے جو خالی جگہ ہے وہاں بہت زیادہ غریب افراد اپنے بیوی بچوں اور گدھا گاڑی سمیت رہائش پذیر ہیں۔ میں جب بھی صبح کے وقت اس پل کے نیچے سے گزرتا ہوں تو خواتین، بچوں اور بزرگوں کو وہاں سویا دیکھتا ہوں جن کے پاس صرف زمین کا بستر ہے۔ کچھ لوگوں کے پاس سوتے ہوئے بدن کو ڈھانپنے کیلئے صرف چادریں ہوتی ہیں بعض خواتین نے دوپٹوں سے اپنے بدن کو لپیٹا ہوتا ہے۔ اُن کے پاس واش روم ہیں نہ بیڈ روم نہ سیٹنگ روم ہیں نہ ہی اپنی گدھا گاڑی کیلئے کوئی علیحدہ برآمدہ یا کمرہ۔ اُس لمحے میں سوچ میں پڑ جاتا ہوں کہ یا رب العالمین یہ بھی تو لوگ کسی کے باپ، ماں، بہن، بھائی، بچے، ماموں، پھوپھا، تایا، چچا اور وہی رشتے جو سب انسانوں کے ہوتے ہیں ان کے بھی تو ہیں، ان کے بھی تو مہمان آتے ہوں گے، ان کے ہاں بھی شادیاں ہوتی ہوں گی، ان کے ہاں بھی موت واقعہ ہوتی ہوگی، کیا ان لوگوں کی خواہشات نہیں کہ اچھے کپڑے پہنیں، اچھی خوراک کھائیں، اچھی چھت کے نیچے رہیں جہاں اے سی لگے ہوں سردیوں میں ہیٹر ہوں، کیا کبھی ان کو اس چھت کے علاوہ بھی سکون ملے گا، آسانیاں ملیں گی؟ یہ بھی تو بیمار ہوتے ہوں گے دوائی کہاں سے لیتے ہوں گے ڈاکٹر کی فیس کون دیتا ہوگا ٹیسٹ کون سی لیبارٹری سے کرواتے ہوں گے؟ کھانا کیسے پکاتے ہوں گے؟

اس کے باوجود بھی یہ لوگ شکر کرتے ہوں گے کہ اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے سر پر چھت تو ہے ہمارے بچے چھت کے بغیر نہیں ہیں۔ کہاں پر ہم جیسے مڈل کلاس، اپر کلاس اور ایلیٹ کلاس لوگ جن کے پاس بے شمار رب تعالیٰ کی نعمتیں ہیں اُن کے باوجود بھی ہم لوگ بڑے ناشکرے ہیں۔ ہم رب سے جب بھی مانگتے ہیں تو گلہ کر کے ہی مانگتے ہیں کہ یا اللہ دوسرے لوگوں کو اتنا دیدیا ہے ہمیں کم کیوں دیا ہے۔ جن کے پاس بڑی بڑی گاڑیاں ہیں بڑے بڑے گھر ہیں بے شمار ملازم ہیں سکیورٹی گارڈز ہیں، ہمارے پاس صرف چھوٹی گاڑیاں، رکشے، ٹیکسیاں یا پھر اب پرائیویٹ کمپنیوں کی گاڑیاں دستیاب ہیں۔ یا اللہ! ہم کب امیر ہوں گے؟

ہم شکر کرنے کی بجائے اپنے رب کی ناشکری کرتے ہیں۔

عبرت

انسانی زندگی پر غور کیا جائے اور ہم سب جہاں جہاں جس جس عمر میں بیٹھے ہیں جو جو جیسا بھی کام کر رہا ہے ایک لمحے کیلئے آپ سب سے درخواست ہے کہ تھوڑی دیر کیلئے رُکیے اور سوچئے جب ہم پیدا ہوتے ہیں تو ہمارے والدین بڑے پیار، محبت، اپنائیت، بے غرضی کے ساتھ بے لوث ہو کر ہماری پرورش کرتے ہیں جب ہم زمین پر گھٹنوں کے بل چلنا شروع کرتے ہیں تو وہ خوش ہوتے ہیں جب ہم پہلا لفظ منہ سے نکالتے ہیں بھلے آدھا ہی کیوں نہ ہوں ام ام ام، اب اب اب تو ہمارے والدین فرطِ جذبات سے جھوم اُٹھتے ہیں۔ جب ہمارے منہ میں پہلا دانت آتا ہے تو والدین کبھی گری تقسیم کرتے ہیں کبھی کوئی اور صدقہ اُتارتے ہیں جب جب بچہ پہلا قدم اُٹھاتا ہے ڈولتے ڈولتے ماں کے کھلے بازوؤں کی طرف بڑھتا ہے تو والدین کی خوشیاں دیکھنے کے قابل ہوتی ہیں، پھر سکول کا پہلا دن۔

آپ پتا نہیں کیا سمجھ رہے ہوں گے مگر میں صرف چند باتیں کرنا چاہ رہا ہوں جو کہ ہم اکثر بیشتر بھول جاتے ہیں۔ رب تعالیٰ نے انسان کو لامحدود نعمتوں سے نوازا ہے اگر ہم کبھی اُس کی نعمتوں کو گننا شروع کریں تو نہیں گن پائیں گے۔ اپنے بدن کو ہی دیکھ لیں تو اُس میں جو جو نعمتیں انسان کو عطا کی ہیں جب اُن پر غور کیا جائے تو رب کے آگے سوائے سر جھکانے کے کوئی اور راستہ نہیں رہ جاتا۔ آج یہ باتیں کرنے کا اچانک اُس وقت خیال آیا جب میں اپنے آفس میں کام کرنے لگا تو عینک تلاش کرنے لگ پڑا۔ مجھے جھٹکا سا محسوس ہوا کہ میں نے رب کی دی ہوئی ایک بہت بڑی نعمت نظر آنے میں کمی محسوس کی جس کی بدولت عینک کا عارضی سہارا لینا پڑ گیا۔ اسی طرح اگر مزید

غور کریں تو کانوں کی سماعتیں بولنے کے الفاظ سر کے بال، چلنے میں لڑکھڑاہٹ وقت کے ساتھ آنا شروع ہو جاتی ہے۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اُس کے دل کی دھڑکن بہت تیز ہوتی ہے عمر بڑھنے کیساتھ ساتھ دل کی دھڑکن بھی رفتہ رفتہ کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ پھر ایک دن ایسا آتا ہے کہ ہمارے بدن کا سب سے مضبوط مَسَل جسے دل کہا جاتا ہے وہ پمپ کرنا بند کر دیتا ہے اور ہماری موت واقع ہو جاتی ہے۔

میرا ہرگز ہرگز آپ کو ڈرانے کا مقصد نہیں ہے، بتانے کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کی وہ تمام نعمتیں جو رب تعالیٰ نے عطا فرمائی ہیں ہمیں چاہیے کہ اُنھیں احتیاط، سلیقے اور کفایت شعاری کے ساتھ استعمال کریں تاکہ ہماری زندگی جس کا کہ ایک ٹائم مقرر ہے ختم ہونے کیلئے اور جس کیلئے ہمارے رب نے الارم لگا رکھا ہے جس وقت وہ الارم بول پڑے گا ہمارا دنیا سے کوچ ہو جائے گا۔ آپ سے صرف اتنی گزارش ہے کہ رب کی دی ہوئی جسمانی، روحانی، ذہنی ظاہری، باطنی تمام نعمتوں کا استعمال سوچ سمجھ کر کریں تاکہ ہم ہماری اور آنے والی نسلوں کی زندگیاں آرام سکون اور پرامن طریقے سے بسر ہو سکیں۔ ہم بحیثیت انسان دنیا میں ایسے کام کر جائیں اور ایسے کام مسلسل کرتے رہیں جن سے انسانوں کو مثبت رویئے اور مثبت آسانیاں میسر ہوتی رہیں۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ مثبت تعلقات استوار رکھیں بھلے وہ گھر میں بہن بھائی ماں باپ ہو محلے گلی کے ہمسائے ہوں، شہر کے باسی ہوں، ہمسایہ ممالک ہوں حتیٰ کے جانور اور رب کی جتنی مخلوقات ہیں جو جو ہمارے معاشرے میں موجود ہیں، جن کا ہمیں علم دیا گیا ہے اور جن کے بارے میں ہم معلومات رکھتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم سب کی حفاظت کریں کسی کو دانستہ نادانستہ نقصان نہ پہنچائیں اپنی اِس دنیا جو کہ پوری انسانیت کا گھر ہے اُس کو پرامن اور پیار کا گہوارہ بنائیں جہاں پر ہم اپنے رب کی دی ہوئی انفرادی اور اجتماعی نعمتوں کا شکرادا کرتے رہیں تاکہ دنیا میں امن اور سکون قائم رہے اور ہم ایک دوسرے کیلئے آسانیاں پیدا کرتے رہیں نہ کہ ایک دوسرے کیلئے عبرت کا نشان بن جائیں۔

امتحان

تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو ایسے لگتا ہے کہ ابن آدم ازل سے ہی امتحان دے رہا ہے آپ سوچیں گے کہ کیسی بات کر رہا ہے یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں اصل میں آجکل پورے ملک میں ہی امتحانات کا سلسلہ چل رہا ہے۔ دنیاوی طور پر کلاس ون سے لے کر پانچویں، آٹھویں میٹرک، انٹر، گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کے امتحانات کا سلسلہ چل رہا ہے۔ اِن دنیاوی امتحانوں کے لئے ہم لوگ اپنے بچوں کو سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں میں بھیجتے ہیں بھلے ہمارے پاس پیسہ ہو یا نہ ہو مگر ایک جستجو ہے ایک دوڑ لگی ہے کہ ہم نے اپنے بچوں کو دنیاوی طور پر بہترین تعلیم دلوانی ہے۔ اِس بہترین تعلیم دلوانے کے سلسلے میں سرکاری، پرائیویٹ سکول، کالج اور یونیورسٹیاں بھی پیش پیش ہیں۔ سرکاری سکولوں کی حالت اور تعلیم دینے کا طریقۂ کار تو نہایت ناقص اور شکست وریخت کا شکار ہے جبکہ پرائیویٹ سیکٹر میں تعلیم بیچی جا رہی ہے وہ بھلے کلاس ون ہو یا پروفیشنل پرائیویٹ یونیورسٹیاں اُن کا معیار صرف اور صرف پیسہ ہے۔

پورے ملک میں تعلیم جو کہ ہر انسان کا بنیادی حق ہے اُسے محدود کر دیا گیا ہے تعلیم بہت مہنگی ہو گئی ہے آپ سوچ رہیں ہوں گے کہ میں بات امتحان کی کر رہا تھا یہ تعلیم بیچ میں کہاں سے آ گئی؟ جی میں آپ کو بتا تا ہوں تعلیم اور امتحان لازم و ملزوم ہیں تعلیم کے حاصل کرنے کیلئے اور اپنے بچوں کو دلوانے کیلئے ہم گیس پیپرز تلاش کرتے ہیں ٹیوشن لگواتے ہیں بے بہا پیسہ خرچ کرتے ہیں کہ کسی طرح میرا بیٹا یا بیٹی دنیاوی طور پر اعلیٰ مقام حاصل کرے مگر نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ وہ پرچہ جو کہ رب تعالیٰ نے ازل سے آؤٹ کیا ہوا ہے اور جس کے بارے میں تمام سوالات کے جوابات بھی رب تعالیٰ نے ابن آدم کو دیدیئے ہوئے ہیں اُس کے باوجود ہم وہ پرچہ حل کرنے کو

تیار نہیں۔ جبکہ اس پرچے کو حل کرنے سے ہماری دنیا سنور سکتی ہے اور آخرت بھی لیکن مجھ سمیت پوری دنیا بالخصوص میرے وطن کے لوگ سب کچھ بھولے ہوئے ہیں۔ دنیاوی اور مادہ پرست زندگی کو کامیاب بنانے کیلئے اپنا تن من دھن سب کچھ لگا رہے ہیں تا کہ لوگ ہمیں عزت کی آنکھ سے دیکھیں اور ہم اپنے سے کم تر لوگوں کو احساس محرومی دلا سکیں۔

یہ کیسی زندگی، کیسی ہوس، کیسا لالچ ہے جو ہمیں ان دیکھے عذاب کی طرف لے جا رہا ہے جبکہ اس کے بارے میں بار بار ہمیں ڈرایا گیا ہے کہ ہمیشہ حق بات لکھو کہو اور کرو مگر ہم لوگ جو تعلیم اور تربیت اپنی نئی نسل اور قوم کو دے رہے ہیں اُس میں صرف اور صرف امتحانات کی بہتات ہے اور جس کا مقصد صرف اور صرف دنیاوی فوائد حاصل کرنا اور بچوں پر بوجھ بڑھانا ہے کہ بیٹا آپ نے ڈاکٹر بننا ہے، انجینئر بننا ہے، بزنس مین بننا ہے، وکیل بننا ہے، بیرسٹر بننا ہے۔

آپ کیسے امتحانات میں پڑ گئے ہیں ہم اپنے بچوں کو وہ پرچہ حل کیوں نہیں کرواتے جو روز اول سے رب تعالیٰ نے ہمیں سوالات اور جوابات کے ساتھ دے رکھا ہے اور اُس میں کسی نقل کرنے کی ضرورت نہیں کسی گیس پیپر کی ضرورت نہیں کسی ٹیوشن کی ضرورت نہیں اُس کے باوجود ہم وہ پرچہ حل کرنے اور کروانے کو تیار نہیں ہیں۔ اگر اِس پرچے میں ہم فیل ہو گئے تو ہماری عاقبت خراب ہو جائے گی، آیئے تھوڑی دیر کیلئے مل بیٹھ کر اس نقطے پر غور کریں اور سوچیں کہ ہم لوگ چھوٹے امتحانات دینے کب بند کریں گے اور سچا امتحان جس کی تیاری کرنے کو ہم راضی نہیں کب تیار ہوں گے۔ بقول منیر نیازی

میں دریا کے پار اُترا تو میں نے دیکھا
ایک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو

تو آیئے سب مل کر یہ عہد کریں کہ ہم اپنی موجودہ نسل کو اور اپنی آنے والی نسلوں کو ایسے تمام امتحانات سے جو کہ عارضی ہوں نقلی ہوں اور ناپائیدار ہوں اُن سے بچائیں اور ایک پیپر جو کہ ابن آدم کے ہاتھ میں ہے اُس کو حل کرنے کی کوشش کریں کیونکہ اُس کے جوابات بھی اسی پرچے میں شامل ہیں۔

عزت نفس

کبھی کبھی سوچتا ہوں غور کرتا ہوں یہ عزت نفس اصل میں ہے کیا یہ حیوانات، پرندوں شاید جمادات ونباتات میں بھی پائی جاتی ہوگی۔ آپ سوچ رہے ہوں گے یہ کیا عجیب سی باتیں آج لکھ رہا ہے پاگل تو نہیں ہوگیا؟ ہاں شاید، کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ شاید میں پاگل ہوں کیونکہ اکثر جو لوگ مختلف طرح کے تخلیقی کام کرتے ہیں وہ چاہے شاعری ہو، نثر ہو، پینٹنگ ہو، فنون لطیفہ کا کوئی شعبہ ہو، میرے خیال میں وہ کسی حد تک پاگل ضرور ہوتے ہیں کیونکہ جب وہ اپنے کام میں جت جاتے ہیں تو وہ دنیا سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ اُن کے اندر ایک جنون اور اپنے کام کے ساتھ وارفتگی اور دیوانگی پائی جاتی ہے مگر اُن کے اندر ایک اور صفت بھی پائی جاتی ہے اور وہ ہے عزت نفس، وہ کسی بھی لمحے کسی بھی موقع پر اپنے کام کے دوران اپنی عزت نفس کو نہ تو مجروح ہونے دینا چاہتے ہیں نہ ہی کسی کو یہ حق دیتے ہیں کہ انھیں تکلیف دیں کیونکہ یہ لوگ معاشرے کے بڑے حساس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔

ویسے تو عزت نفس ہر انسان کی ہوتی ہے بھلے وہ جھاڑو دینے والا خاکروب ہو، رکشہ اور ٹیکسی چلانے والا ڈرائیور ہو، آپ کے گھر کا خانسامہ ہو، آپ کے اپنے بچے ہوں، آپ کے رشتہ دار ہوں، محلے کی مسجد کا خادم اور امام مسجد ہوں، آپ کے محلے کا چوکیدار ہو آپ کے بچوں کا اُستاد ہو کوئی ریڑھی بان ہو، کوئی مزدور ہو، مستری ہو، ویلڈر ہو، امیر کارخانے دار ہو، زمیندار ہو یا کسی زمین پر مزارعہ ہو، کسی مزار کا مجاور ہو، کوئی سرکاری ملازم ہو، اسکا کسی بھی شعبہ زندگی سے تعلق ہو ہر ذی روح شخص اور کسی حد تک حیوانات جن کے دل دھڑکتے ہوں اُن کے اندر عزت نفس پائی جاتی ہے۔

عزت نفس کو اقبال نے خودی کا نام دیا ہے۔ مولانا روم سے کسی نے پوچھا کہ زہر کیا ہوتا ہے تو آپ نے جواب دیا کسی بھی چیز کا بہت زیادہ ہونا زہر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر بہت زیادہ صاحبِ علم

ہونا، بہت زیادہ امیر ہونا، مالدار ہونا، بہت زیادہ خوش ہونا اور بہت زیادہ خود پسند ہونا۔ ایسی تمام چیزیں زہر سے مشابہت رکھتی ہیں اور مجھ جیسے ناچیز کی عقل کے مطابق اگر عزت نفس کا خیال نہ رکھا جائے خاص طور پر ایسے طبقے کیلئے جو کہ مالی طور پر پسماندہ ہو تعلیمی طور پر کمزور ہو ذہنی طور پر ناسمجھ ہو خاص طور پر ہمارے معاشرے کا مڈل کلاس طبقہ جو انتہائی حساس ہوتا ہے کیونکہ نہ تو وہ بہت زیادہ امیر ہوتا ہے اور نہ ہی بہت زیادہ غریب۔ وہ اِن دونوں طبقوں کے بیچ میں پس کر رہ جاتا ہے جو بہت زیادہ امیر لوگ ہوتے ہیں انھیں کسی چیز کی پرواہ نہیں ہوتی اسی طرح بہت زیادہ غریب ہوتے بھی عزت نفس کے احساس سے ماورا ہوتے ہیں لہٰذا آج کے صرف اور صرف مڈل کلاس اور لوئر مڈل کلاس اِس احساس کو جو کہ عزت نفس سے منسلک ہوتا ہے بہت زیادہ محسوس کرتے ہیں کیونکہ نہ تو وہ تین میں ہوتے ہیں نہ تیرہ میں۔ وہ اسی کشمکش میں اپنی زندگی گزارنے کی تگ ودو کرتے ہیں کہ کسی طرح سے اُن پر شرافت کا لبادہ بھی رہے اور اُن کی ظاہری و باطنی کمی بیشیوں کا پتہ دوسروں کو نہ چل سکے۔ اسی تگ ودو میں وہ اپنے بچوں کی شادیوں اور اپنے گھروں کی فوتگیوں پر بے شمار قرضہ اُٹھا لیتے ہیں تاکہ اُن کی عزت معاشرے میں قائم رہے اور وہ اپنی عزتِ نفس بچا سکیں۔ اِس کا کسی حد تک ذمہ دار وہ امیر طبقہ ہے جس نے سفید پوش طبقے کیلئے اپنے عمل سے بہت ساری مشکلات پیدا کیں جس کی بناء پر سفید پوش طبقے کی عزتِ نفس مجروح ہوئی اور مجروح ہو رہی ہے جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ تم اپنے گھر میں کبھی کوئی اچھا سالن پکاؤ اور اُس کی خوشبو گھر سے باہر جائے تو تم پر یہ فرض ہے کہ اپنے ہمسائے کو اپنے اُس سالن میں سے کچھ حصہ ضرور دو جو کہ وہ سالن کھانے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ اِسی طرح ایک اور مقام پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب بھی تم کوئی ایسا موسمی پھل لاؤ جو کہ قیمتی ہو اور تمہارا ہمسایہ اُس کو خریدنے کی قوت نہ رکھتا ہو تو ایسے پھل کے چھلکے کبھی اپنے گھر کے باہر کوڑے میں مت پھینکو اگر تم ایسا کرو گے تو تمہارے سفید پوش ہمسایہ کی دل آزاری ہوگی اور اُس کی عزت نفس مجروح ہوگی۔

اس لئے ہمیں چاہیے کہ ہر لمحے اپنے اندر یہ خیال پختہ کرلیں کہ جو بھی عمل کریں یہ سوچ سمجھ کر کریں کہ کیا ایسا کرنے سے ہمارے کسی دوست اور ہمسائے کو تکلیف تو نہیں پہنچے گی۔

ندامت

جب کوئی قریبی رشتہ دار یا دوست آپ کو اچانک چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو جائے تو یقین مانیے بڑی تکلیف ہوتی ہے وہ لوگ جو کہ بہت زیادہ حساس ہوتے ہیں اُن کو خاص طور پر اور وہ لوگ جو زیادہ حساس نہیں ہوتے اُن کیلئے جینا مرنا روٹین کا کام ہے اور کسی حد تک دیکھا جائے تو بات بھی ٹھیک ہے کیونکہ پیدائش ایک فطری عمل ہے اور اِسی طرح مرنا بھی ایک طے شدہ امر ہے۔

رب تعالیٰ نے کلام پاک میں ارشاد فرمایا ہے کہ ہر ذی نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا پڑے گا اور ہم سب اِس کے پابند ہیں اور اپنی اپنی باری کے منتظر ہیں۔ کوئی پہلے آتا ہے اور کئی برس جیتا ہے اور کوئی پیدا ہوتے ہی مر جاتا ہے کوئی بچپن میں مر جاتا ہے، کوئی لڑکپن جوانی میں مر جاتا ہے اور کوئی بڑھاپے میں بڑی کسمپرسی اور بے بسی کی حالت میں جا کر مرتا ہے۔ غرضیکہ مرنا سب نے ہے اور مرنے کیلئے کوئی نہ کوئی بہانہ ہونا ضروری ہے کوئی ایکسیڈنٹ میں مرتا ہے، کوئی دل کا اٹیک ہونے سے مرتا ہے، کوئی فالج سے مرتا ہے غرض بدن کے جتنے بھی اعضاء ہیں اُن میں سے کسی نہ کسی ایک کے فیل ہونے سے کام نہ کرنے سے انسانی زندگی ختم ہو جاتی ہے اور ختم ہونی بھی ہے۔ اِس کے باوجود ہم انسانوں میں جو باقی زندہ رہتے ہیں اُن کو یقین کامل ہوتا ہے جو کہ صرف خوش فہمی ہے کہ انھوں نے نہیں مرنا۔ یہ اتنی بڑی خوش فہمی ہے کہ جس میں ہم زندہ لوگ مبتلا ہیں اگرچہ ہم لوگ اپنے پیاروں کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اُتار کر مٹی اُن پر ڈال کر گھروں میں واپس آتے ہیں چند دن دکھ تکلیف اور ڈپریشن میں رہتے ہیں مگر پھر وہی دنیا اور دنیا کی مکاریاں، عیاریاں، منافقتیں اور چال بازیاں ہمیں سب کچھ بھلا دیتی ہیں کہ ہم نے بھی مرنا ہے۔

آپ نے کبھی غور کیا ایسا کیوں ہوتا ہے ہمیں پیدا کوئی کرتے ہیں، تعلیم کوئی اور لوگ دیتے ہیں، نوکریاں بھی دوسرے لوگ دیتے ہیں، عزت اور وقار بھی دوسروں کی طرف سے ملتا ہے، پہلا اور آخری غسل بھی دوسروں کے ہاتھوں ادا ہوتا ہے۔ مرنے کے بعد جو ہمارے نام پراپرٹی اور پیسہ ہوتا ہے وہ بھی دوسروں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، جنازہ بھی دوسرے اُٹھاتے ہیں۔ میں حیران ہوں

کہ اِس کے باوجود ہمارے اندر اس قدر تکبر کیوں پیدا ہو جاتا ہے، ہم اپنی زندگی کو آسان طریقوں سے کیوں بسر نہیں کر سکتے ہمارے اندر نفرتیں کدورتیں بغض حسد اور بے ایمانی ختم کیوں نہیں ہوتی؟ یہ ہمارے لئے بہت بڑا سوالیہ نشان ہے۔

آیئے بیٹھ کر ٹھنڈے دل سے اِن تمام حالات و واقعات پر آج سے غور کرنا شروع کریں اپنے پیارے اور قریبی دوست احباب جو ابھی زندہ ہیں اُن کے ساتھ اگر ہماری کوئی رنجش کوئی گلا شکوہ کوئی ناراضی ہے تو اُسے فوری ختم کر دیں، انھیں سچے دل سے معاف کر دیں۔ اِس عمل کو کرنے کیلئے آپ کہیں گے کہ آپ کے رشتہ دار پہل کیوں نہیں کرتے تو میں یہ مشورہ دوں گا کہ اگر وہ پہل نہیں کرتے تو ہم پہل کر لیتے ہیں اس میں کوئی ہماری ہتک اور بے عزتی نہیں ہوگی بلکہ ہم اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آگے سرخرو ہوں گے اور زندگی میں جو غلط اعمال ہم سے سرزد ہوئے ہیں اللہ پاک ہمارے وہ گناہ معاف کر دیگا کیونکہ رب تعالیٰ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے اُس کیلئے کچھ بھی ناممکن نہیں وہ جس کرسیٔ عرش پر متمکن ہے اُس پر نہ اُسے اونگھ آتی ہے نہ ہی نیند اُس کے کن فیا کون کہنے سے تمام کام ہو جاتے ہیں۔

آیئے آج سے عہد کریں کہ ہم جس رب کی مخلوق ہیں جس نبی کی اُمت ہیں اُن کے احکامات کی پیروی کریں ایک دوسرے کے ساتھ زندگی کے جو گنے چنے چند لمحات ہیں وہ ہنسی خوشی بسر کریں تاکہ جب دنیا سے رخصت ہوں تو جنازہ اُٹھانے والے ہمیں اچھے الفاظ سے یاد کریں۔ یہ جو باتیں میں نے آپ سے کی ہیں ان کا مقصد صرف اتنا ہے کہ ہم مثبت سوچ کیساتھ اپنے گھروں میں رہیں اپنے ملک میں بھی۔ ملک میں جتنے افراد بستے ہیں وہ سب ہمارے بہن بھائی ماں باپ بزرگ اور بچے ہیں ہمیں ان سب کی عزت و توقیر کرنی ہے ان کے تمام مسائل ہمارے مسائل تمام خوشیاں ہماری خوشیاں ہیں۔ ہم نے کسی کو کسی پر برتری نہیں دینی سوائے اعمال کے سبب سے جن کے اعمال اچھے ہیں، اُن سے پیار کریں گے جن کے اعمال میں کچھ خرابیاں ہے مجھ سمیت اُن کو درگزر کریں گے انھیں ٹھیک کرنے کی کوشش بھی کریں گے اور اِس کوشش میں اُن سب کی رہنمائی بھی کریں گے۔

کشمکش

آج کا دور جو کہ بہت ہی ترقی یافتہ دور سمجھا جاتا ہے اس دور میں پوری کائنات اور انسانی عقل و فراست اپنی انتہاؤں پر ہے ہر شعبۂ زندگی میں انسان ترقی کے مدارج طے کر رہا ہے خاص طور پر میڈیکل سائنس میں چونکا دینے والی حد تک بے شمار مہلک بیماریوں کے علاج واضح ہو چکے ہیں مگر ایک بیماری جو اب تک لا علاج ہے وہ بیماری ہے موت۔ انسان آج تک موت کا بھید نہیں جان سکا وہ اس میں ابھی تک تحقیق کر رہا ہے۔

میں جب آج ایک سرکاری ہسپتال میں اپنے دوست کی عیادت کرنے کیلئے گیا تو یہ دیکھ کر حیران پریشان ہو گیا کیونکہ میرے چاروں طرف انسانوں کا ہجوم تھا کوئی ویل چیئر پر تھا کوئی سٹریچر پر تھا کوئی ایمرجنسی میں تھا کوئی او پی ڈی میں تھا غرضیکہ پورا ہسپتال بیماروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا میں سوچ میں پڑ گیا۔

آپ پورے پاکستان پوری دنیا کے ہسپتالوں میں جائیں، پرائیویٹ کلینکس میں جائیں، حکیموں کے پاس جائیں، ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کے پاس جائیں یا کسی عطائی ڈاکٹر اور حکیم کے پاس چلے جائیں آپ کو ہر جگہ بیمار اور بیماریاں ملیں گے آپ چند لمحوں کیلئے پریشان ہو جائیں گے سوچیں گے کہ کیا پوری دنیا ہی بیمار ہے؟ ایک عجیب سا احساس میرے اندر سے نکلا وہ یہ تھا کہ یہ سب لوگ جو بیمار ہیں ہسپتالوں میں دھکے کھا رہے ہیں صرف اور صرف اپنی زندگی بچانا چاہتے ہیں مرنا نہیں چاہتے کسی قریب المرگ مریض کے پاس اگر آپ کھڑے ہوں تو وہ آپ سے کہے گا دُعا کریں میں ٹھیک ہو جاؤں۔ زندگی کا نشہ کتنا ظالم ہے کوئی بھی دنیا چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا بھلے کتنی عبرتناک

بیماریوں سے گزرنا پڑے۔ زندہ رہنے کی کشش جستجو مہلک سے مہلک بیماریوں کیخلاف لڑنے کی ہمت اور قوت عطا کرتی ہے۔

وطن عزیز پاکستان میں جو کہ نئی مردم شماری کے مطابق جسکا ابھی سرکاری طور پر اعلان نہیں کیا گیا 21,22 کروڑ لوگ بستے ہیں۔ مزید تحقیق کی تو پتا چلا کہ میرے ملک میں رجسٹرڈ ایم بی بی ایس ڈاکٹرز کی تعداد 138,421 ہے ان میں سے پنجاب میں 55,909 ڈاکٹرز سندھ میں 56,039 کے پی کے میں 16,534 بلوچستان میں 3,973 اے جے کے میں 2,529 اور ان میں فارن نیشنلز کی تعداد 3,437 ہے۔ ٹوٹل سپیشلسٹ میرے ملک میں 29,867 ہیں۔ غور کریں کہ 138,421 ڈاکٹرز تقریباً 20,21 کروڑ کی آبادی کا علاج کر رہے ہیں جب کہ جعلی ڈاکٹرز بیشمار ہیں اِن سارے اعداد و شمار کے بتانے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ انسان کے اندر رب تعالیٰ نے زندگی اور موت کا جو کھیل رچا رکھا ہے اس کھیل میں ہمیشہ فتح موت کی ہوتی ہے۔ اس سب کے باوجود ہم لوگ دنیا داری کے دھندوں میں اس قدر اُلجھ چکے ہیں کہ ہم میں سے کوئی بھی مرنا نہیں چاہتا اور دنیا کے لالچ میں نفسا نفسی کا شکار ہے۔ یہ ہمارے لئے بطور انسان لمحہ فکریہ ہے، رب تعالیٰ نے ابلیس سے کہا تھا کہ میرے نیک لوگ تیرے ورغلانے میں نہیں آئیں گے مگر آج کا معاشرہ اور پوری کائنات کو آپ اگر دیکھیں تمام کی تمام ماسوائے چند اللہ کے محبوب لوگوں کے دنیا کی دلدل میں اور ابلیس کے بہکاوے میں آچکے ہیں اللہ ہمیں اپنے اُن چند لوگوں میں شامل کرلے جو کہ اُسے بہت عزیز ہیں۔ آمین

کھچڑی

پاکستان جس جغرافیائی محلے وقوع پر موجود ہے اُس کا بغور جائزہ لیا جائے تو پاکستان کے جنوب میں سمندر ہے شمال میں افغانستان، ایران اور مشرق کی جانب بھارت ہے جبکہ زمینی تعلق چائنہ سے بھی ہے جو اقتصادی طور پر پوری دنیا کے نقشے پر سونامی کی طرح پھیلتا چلا جا رہا ہے چائنہ نے تقریباً 60 فی صد سے زیادہ سعوی عرب میں اپنی کمپنیوں کے ذریعے پاؤں جمائے اور آہستہ آہستہ جزیرہ نما عرب سے امریکہ کو نکالنے کی پوزیشن میں آچکا ہے۔ امریکہ بھی کافی حد تک عرب دنیا سے خود کو نکالنا چاہتا ہے مگر ساتھ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں چائنہ سی پیک کے ذریعے اپنا عمل دخل نہ بڑھائے۔ اسی وجہ سے ٹرمپ انتظامیہ پاکستان اور چین کی اقتصادی راہ داری کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کیلئے راضی نہیں ہیں اور مودی سرکار بھی اس خطے میں چین کو سپر پاور ماننے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ یہی بات امریکہ کو بھی پسند ہے امریکہ جو کہ افغانستان سے اپنی فوجیں نکالنا چاہتا ہے اس سلسلے میں وہ بھارتی افواج کو افغانستان بھیجنا چاہتا ہے جبکہ بھارت یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہے۔

امریکہ، بھارت اور افغانستان ان تینوں کا مفاد ایک ہے کہ کسی نہ کسی طرح سے پاک چین تعلقات کو توڑا جائے اور اس سلسلے میں یہ تینوں ممالک مل کر پاکستان کے اندر داخلی انتشار پیدا کرنا چاہتے ہیں جس کی سب سے بڑی مثال بلوچستان سے پکڑا گیا انڈین نیول آفیسر کلبھوشن یادیو ہے۔ اسی طرح پاکستان کے مختلف فرقوں کو آپس میں لڑانے کی کوششیں اور سازشیں کی جارہی ہیں دوسری طرف امریکہ داعش کے بے شمار لوگوں کو اکٹھا کر کے افغانستان میں جمع کر رہا ہے تا کہ داعش کے ذریعے پاکستان کے اندر دہشتگردی اور بدامنی کو بڑھایا جاسکے اس کے علاوہ پاکستان کو سیاسی طور پر بھی کمزور کیا جارہا ہے جس کی بڑی مثال ایک نااہل وزیراعظم کو قومی اسمبلی کے ذریعے مسلم لیگ (ن) کا صدر بنانے کی آئینی ترمیم پاس کروائی گئی جس کی مثال کسی جمہوری ملک میں نہیں ملتی اور پورے ملک کو نیب کی لال بتی کے پیچھے لگا دیا گیا ہے۔ سابقہ حکمران خاندان اور اس کے حواری عدلیہ کے ایک بے مثال فیصلے کو تضحیک کا نشانہ بنا رہے ہیں اور نیب کے ریفرنس کے حوالے سے

آنکھ مچولی کھیلی جا رہی ہے پہلے بیٹے آئے پھر بیٹی، داماد پھر موجودہ وزیرِ خزانہ جن کے اثاثے اپنی آمدن سے 91 فی صد زیادہ ہیں بہت ہی افسوس کی بات ہے کہ ہمارے موجودہ عارضی وزیرِ اعظم نے اپنی کابینہ میں ایسے لوگوں کو رکھا ہوا ہے۔ ان سارے حالات کا بغور جائزہ لیا جائے تو ان کے پیچھے پورا ماسٹر مائنڈ کام کر رہا ہے جو اپنے ذاتی مفادات پر پورا ملک قربان کرنے سے بھی باز نہیں آئیں گے، ان کی محبت ملک کے ساتھ اتنی ہے کہ غریب لوگوں پر حکومت کرنا اُن کے ٹیکس کے پیسوں سے عیاشی کرنا۔

سابق نااہل وزیرِ اعظم نے اپنے چار سالہ دورِ اقتدار میں 100 سے زیادہ غیر ملکی دورے کیے جن کا بزنس پاکستان سے باہر ہے جن کی پراپرٹی پاکستان سے باہر ہے جن کی اولادیں پاکستان سے باہر ہیں یہ کیسے پاکستانی ہیں۔ ان کے اندر تو پاکستان کے ساتھ حب الوطنی کا احساس ہی نہیں ہے جس زمین پر ان کے پاؤں ہی نہیں ٹکتے اولادیں ہی نہیں رہتیں کارخانے اور جائیدادیں ہی نہیں وہ بھلا اس ملک کو کیا ترقی دے سکیں گے؟ یہ لوگ تو بزنس مین ہیں اور کاروباری کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کرتا۔ سابقہ حکمران خاندان نے ملک کے تمام قومی اداروں کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیا ہے۔ آپ کسی بھی بڑے قومی ادارے کو اُٹھا کر دیکھ لیں وہ آخری سانسیں لے رہا ہے محض ان چند مٹھی بھر لوگوں نے تعلیم سیلف فنانس کر دی میڈیکل عام غریب آدمی سے چھین لیا، قرضوں کی بہتات کر دی جس کی وجہ سے آج پاکستان اقتصادی ایمرجنسی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ان لوگوں کو اپنی جانیں اور جائیدادیں سنبھالنے کے سوا کوئی کام نہیں یہ لوگ صرف اپنا آپ، اپنی دولت بچانا چاہتے ہیں یہ لوگ اس حد تک جا سکتے ہیں کہ قومی سلامتی کو اور دو قومی نظریئے کو داؤ پر لگا سکیں۔ ایک طرف ایک پارٹی نے لوٹ مچا رکھی ہے دوسری طرف دوسری جماعت نے آئین کی دھجیاں اُڑا کر رکھ دی ہیں پھر بھی کہتے ہیں ہمیں کیوں نکالا؟ چاروں طرف سازشوں کی کھچڑی پک رہی ہے دو ادارے عدلیہ اور افواج ہیں اللہ کرے یہ قائم رہیں۔ پاکستان جو کہ ہمیشہ قائم رہنے کیلئے بنا ہے انشاء اللہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ کرپٹ سیاستدانوں اور کرپشن زدہ معاشرے میں نوجوان نسل سے اُمید ہے کہ وہ آنے والے وقتوں میں ملک کی باگ ڈور ایمانداری اور خلوص نیت سے سنبھالے گی۔

چنیوٹ

رات کافی ہو چکی تھی میں خود بھی تھکاوٹ کا شکار ہو چکا تھا جب گھر میں داخل ہوا تو جاوید بھائی ہمارے انتظار میں بیٹھے تھے انھوں نے کہا میں نے تیرا اسارا پروگرام ریڈیو پر سنا ہے بڑا اچھا لگا۔ میں چونکہ تھکا ہوا تھا اُن سے سرسری سی بات کر کے سونے کیلئے اپنے کمرے میں چلا گیا اگلی صبح میں دیر تک سویا رہا جب آنکھ کھلی تو دن کے گیارہ بج چکے تھے۔ منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کیا میں اور جاوید بھائی رکشے میں بیٹھ کر لائل پور کی سڑکوں پر گھومنے لگے میں نے باہر ہی سے زرعی یونیورسٹی دیکھی گھنٹہ گھر دیکھا جس کے چاروں طرف 8 بازار کھلتے ہیں کچہری بازار، سمندری بازار اور اِس طرح تمام بازاروں کا کوئی نہ کوئی نام ہے۔ پھر ہم نے لائل پور کی مشہور چنے کی دال کھائی جو کہ ہزارہ ریسٹورنٹ سے ملتی ہے۔ دال کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ جب لائل پور آباد کیا گیا اور یہاں پر بسوں کے اڈے قائم ہوئے تو ہزارہ کے ایک خاندان نے آ کر یہاں پر چھوٹا سا ہوٹل کھولا اُن کا سب سے مزیدار جو پکوان ہوتا تھا وہ خالص گھی میں تڑکا لگی ہوئی چنے کی دال تھی جو کہ آج تک لائل پور میں چل رہی ہے۔ اب ہزارہ ریسٹورنٹ کی کافی شاخیں قائم ہو چکی ہیں۔

واپسی پر میں نے جاوید بھائی سے چنیوٹ کے بارے میں ذکر کیا تو انہوں نے کہا کوئی بات نہیں تمھیں صبح کاشف چنیوٹ لے جائے گا۔ لائل پور پاکستان کا تیسرا بڑا شہر ہے مجھے اِس لئے بھی اچھا لگا کہ کشادہ سڑکیں ہیں کوئی رش نہیں کوئی ٹریفک جام نہیں ہوتا حتیٰ کہ جب آپ گھنٹہ گھر کی طرف جائیں تو وہاں پر بھی سڑکیں اُن بازاروں کی اتنی کھلی ہیں کہ موٹر سائیکلیں، مکھی اور مچھروں کی طرح پارک ہوئی ہوتی ہیں۔ گاڑیاں بھی پارکنگ میں ہوتی ہیں اس کے باوجود بھی آپ

گاڑیوں میں اُن بازاروں سے گزر سکتے ہیں۔ اگلے دن صبح کاشف ہمیں چنیوٹ لے گیا چنیوٹ کا فاصلہ لائل پور سے کچھ 40 منٹ کی ڈرائیو پر ہے آپ اگر آرام سے جائیں تو ایک گھنٹہ لگ جاتا ہے۔ جب ہم چنیوٹ میں داخل ہوئے تو کاشف نے بتانا شروع کیا کہ چنیوٹ میں جہاں فرنیچر کا بہت شاندار کام ہوتا ہے وہاں پر چنیوٹ کی وجہ شہرت دو تین اور مقامات بھی ہیں اُن میں ایک مقام دریائے چناب کے پل کے قریب ہے جہاں پر حضرت بو علی قلندرؒ نے چناب کے پانی میں کھڑے ہو کر چلا کاٹا تھا۔ شہرت کی دوسری وجہ شاہی مسجد ہے جو کہ 17 ویں صدی میں مغل بادشاہ کے ایک وزیر نے بنوائی تھی۔ تیسری اور سب سے زیادہ دلچسپ عمارت جو چنیوٹ میں اپنی خوبصورتی میں کوئی ثانی نہیں رکھتی وہ عمر حیات محل ہے۔ یہ عمارت 1925ء میں چنیوٹ کے ایک امیر شیخ نے اپنے بیٹے کیلئے بنوائی تھی اس عمارت کو بننے میں 6 برس لگے اِس عمارت کی خاص بات یہ ہے کہ یہ 5 منزلہ عمارت عمر حیات نامی تاجر نے اُس دور میں 4 لاکھ روپے کے زرِ کثیر سے تعمیر کرائی تھی لیکن اِس کے مکمل ہوتے ہی عمر حیات اِس جہاں سے رخصت ہو گیا۔ اس کے اکلوتے بیٹے گلزار محمد نے کلکتہ میں اپنے کاروبار کو سمیٹ کر چنیوٹ آباد ہونے کا فیصلہ کیا اور 1937ء میں اُس کی شادی کی تقریبات نہایت گلزار منزل میں منعقد ہوئیں لیکن شادی کے اگلے ہی روز گلزار محمد بھی پراسرار انداز میں موت کا شکار ہوا۔ نصف صدی گزرنے کے باوجود یہ مرگ ناگہانی کسی معمے سے کم نہیں عمر حیات اور گلزار محمد کی وفات کے بعد ان کے ورثاء اِس محل کو منحوس سمجھ کر یہاں سے کنارہ کش ہو گئے جس کی وجہ سے مناسب نگہداشت نہ ہونے کی وجہ سے مقامی رہائشی طرز تعمیر کا یہ شاہکار شکست و ریخت کا شکار ہونے لگا اور رفتہ رفتہ اس کا سارا حسن ماند پڑ گیا۔ چند سال قبل جب اِس کی بلند ترین منزل منہدم ہوئی تو یہ خدشہ پیدا ہوا کہ کچھ ہی عرصے میں یہ عمارت زمین بوس ہو جائے گی اور اہلیان چنیوٹ ایک عظیم تاریخی ثقافتی ورثے سے محروم ہو جائیں گے۔ اس عمارت کو وقت کی دست برد سے بچانے کیلئے 1990ء میں جھنگ کے ڈپٹی کمشنر محمد اطہر طاہر نے انتھک کوشش کی اور اِس عمارت کو سرکاری تحویل میں لے کر لائبریری کا درجہ دیدیا۔ اِس سے پہلے مقامی لوگوں کا خیال تھا کہ یہ عمارت منحوس ہے یہاں پر آسیب کا سایہ ہے کیونکہ جس دن عمر حیات

کے بیٹے گلزار کی شادی ہوئی تھی اُس سے اگلے روز جب وہ غسل خانے میں نہانے گیا تو ایک روایت کے مطابق کوئلوں کی گیس کی وجہ سے وہیں پر فوت گیا۔

جس دن ہم عمر حیات کا محل دیکھنے گئے اتوار کا دن تھا کیونکہ اب یہ محل لائبریری بن چکا تھا اِس لئے وہاں پر تالہ لگا ہوا تھا مگر ہمارے ایک قریبی بزرگ رشتہ دار نے اپنے تعلقات کی بناء پر عمر حیات محل کو ہمارے لئے کھلوایا۔ ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اِس 5 منزلہ عمارت کو کتنے خوبصورت طریقے سے بنایا گیا ہے اِس کے نقش ونگار انتہائی بے مثال ہیں۔ عمارت کے صدر دروازے کے باہر اُن کاریگروں کے نام بھی لکھے ہوئے تھے جنھوں نے یہ خوبصورت عمارت بنائی۔ عمارت کے اندر 2 قبریں بھی ہیں ان کاریگروں میں اُستاد الٰہی بخش پرجھ، دوسرے کا رحیم بخش پرجھ، مستری فضل احمد، مستری احمد دین، نیاز احمد جالندھری، غلام علی جالندھری، نقاش جان محمد اور نقاش غلام معید الدین کے نام شامل ہیں۔

چنیوٹ جس کا اصل نام چنووٹ تھا جو کہ چندر گپت موریہ کی رانی تھی اور یہاں پر بھیس بدل کر شکار کھیلنے آیا کرتی تھی اُس نے اپنا نام چنووٹ رکھا ہوا تھا جو کہ بعد میں زبان کے لہجے کی تبدیلی کے باعث چنیوٹ بن گیا۔ چنیوٹ دریائے چناب کے کنارے پر واقع ہے اِس کے گردونواح میں خوبصورت پہاڑ بھی ہیں۔ انگریز کا تعمیر کیا ہوا ایک پل ہے جس کے اوپر سے ٹرین گزرتی ہے اور نیچے سے عام ٹریفک۔ چنیوٹ کی خوبصورتی اور دلکشی نے اتنا سرور بخشا کہ جب میں واپس آ رہا تھا تو میرے ذہن میں پنجابی کی چند لائنیں آ رہی تھیں۔

پتلا نک تے تکھی اکھ
ہتھاں اُتے مہندی تے بُلاں اُتے سکھ

مزدور

اکثر صبح آفس جاتے ہوئے چاندنی چوک کے قریب مزدور بہت لمبی قطار بنا کر بیٹھے ہوتے ہے یہ لوگ پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے ٹوٹے ربڑ کے جوتے پاؤں میں ہاتھ میں بیلچا، گینتی اور دھبڑا اپنے آگے رکھے کر بیٹھے ہوتے ہیں۔ بعض کے ہاتھوں میں سفیدی کرنے والے برش ہوتے ہیں اور بعض خالی ہاتھ ساتھ بیٹھے ہوتے ہیں جب کوئی بندہ اپنے گھر کے کام کاج اور مرمت کیلئے ان میں سے کسی ایک کو چننے لگتا ہے تو یہ سارے دوڑ کر اُس کے قریب آجاتے ہیں ہر ایک کی کوشش ہوتی ہے کہ مجھے مزدوری مل جائے میری آج کی دیہاڑی لگ جائے۔ اچھا راج مستری ہزار روپے سے لے کر 1500 روپے تک دیہاڑی لے رہا ہے جبکہ مزدور 500 سے لے کر 700 روپے تک کی دیہاڑی لیتا ہے مگر یہ سارے مقدر کی بات ہوتی ہے کیونکہ بعض کو مزدوری مل جاتی ہے اور باقی جو ہوتے ہیں وہ اپنا سامان لے کر پھر قطار میں بیٹھ جاتے ہیں اور کسی اور کے آنے کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ جیسے جیسے دن گزرتا ہے اُن کے چہرے پر مایوسی کے سائے پھیلتے جاتے ہیں اور پھر جب دوپہر ڈھل جاتی ہے تو قریب ہی ایک ویلفیئر ٹرسٹ کے لوگوں نے مفت کا دسترخوان بنا رکھا ہے تو یہ لوگ اُٹھ کر اُس دسترخوان کی طرف دوڑتے ہیں جو دال سبزی پکا ہوتا ہے یہ لوگ وہاں سے لیتے ہیں اور کھانے لگ پڑتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر کا تعلق اٹک سرگودھا اور میانوالی کے اضلاع سے ہوتا ہے پھر یہ لوگ شام کو اپنے اپنے کرائے کے کمروں یا بیٹھکوں میں سونے کیلئے چلے جاتے ہیں۔

یہ تقریباً ان کا روز کا معمول ہے مگر ایک بات آپ سے شیئر کرنی ہے جب ان لوگوں کو کوئی اچھا کام مل جاتا ہے تو یہ لوگ اپنا کام ایمانداری سے کرنے کو تیار نہیں ہوتے سیمنٹ ریت، بجری اور سریے میں سے چوری کرنا شروع کر دیتے ہیں یا پھر کام صفائی سے نہیں کرتے۔ وہی انسانی رویئے جس میں لالچ، حرص اور ناشکری کا عنصر ہوتا ہے ان کے اندر ابھر آتا ہے پھر جب لوگ ان کو رنگے

ہاتھوں چوری کرتے پکڑتے ہیں تو یہ خود کو مظلوم بنا کر معافی مانگنا شروع کر دیتے ہیں حالانکہ ان کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ رب تعالیٰ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بارہا یہ ارشاد فرمایا ہے کہ ناپ تول میں بے ایمانی مت کرو، جو بھی کام کرو ایمانداری، خلوص نیت اور حلال روزی حاصل کرنے کیلئے کرو تا کہ تمہارے رزق میں برکت آئے اور اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو تمہارے رزق میں نہ اضافہ ہوگا نہ ہی برکت آئے گی اور ایسی کمائی ہوئی دولت بہتری کا باعث بن سکتی ہے۔

آپ کہیں گے کہ آج کیسی باتیں شروع کر دیں، غریب مزدوروں کیخلاف لکھنا شروع کر دیا با خدا میرا ہرگز یہ مقصد نہیں میں تو خود غربت کی انتہائی نچلی سطح پر زندگی بسر کرنیوالوں کیلئے کچھ کرنے کا خواہش مند ہوں اور آج کا جو میرا موضوع ہے اُس کا بھی یہی مقصد ہے کہ جو بھی شخص میرے اس کالم کو پڑھے جب وہ اپنے گھروں میں مزدور، مستریوں، پینٹ کرنے والوں پلمبر یا الیکٹریشن کو لائے تو اُن کی عزت کی جائے ان سے اچھے طریقے سے کام کروایا جائے اُن کی عزت نفس کو مجروح نہ کیا جائے۔ اُن کو اپنے قول وفعل سے مثبت باتیں بتائی جائیں تا کہ اگر اُن کے اندر کوئی بے ایمانی منافقت اور مالک کے ساتھ ہیرا پھیری کرنے کی نیت ہو تو آپ کے اچھے عمل سے اُن کے دل میں کوئی بُرا خیال نہ آئے بلکہ وہ آپ کے کام کو اس طرح سے کرے جیسے اپنے گھر کا کام کر رہا ہے اور جب کام مکمل ہو جائے تو آپ کو چاہیے کہ اُن کی مزدوری اُن کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کر دیں۔ اگر ہم ایسے رویہ ایک دوسرے کے ساتھ ہر شعبۂ زندگی میں قائم کریں تو میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے معاشرے میں جو بے ایمانی منافقت اور دہرا معیار زندگی قائم ہو چکا ہے وہ ختم نہ ہو جائے۔

آیئے آج ہم سب مل کر یہ عہد کریں کہ ہم لوگ اپنے ملک کو ترقی یافتہ اور کامیاب بنانے کیلئے ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے ایک دوسرے کی مدد کریں گے بالکل ایسے جیسے ایک اینٹ اور اُس کے درمیان سیمنٹ اور پھر اینٹ اور پھر سیمنٹ لگانے سے دیواریں مضبوط ہوتی ہیں اسی طرح ہم اپنے ملک اور معاشرے کو ایمانداری اور سچ کے میٹریل سے مضبوط اور پائیدار بنائیں گے اور ایک کامیاب پاکستانی مزدور کہلانے میں فخر محسوس کریں گے۔

مڈل کلاس

عید قربان کی آمد آمد ہے جانور منڈیوں میں آ چکے ہیں یا لائے جا چکے ہیں ہم لوگ روزانہ ٹی وی پر مختلف چینلز پر اُن کے بارے میں خبریں سنتے اور دیکھتے ہیں جس میں کوئی تیس لاکھ کا بیل ہے، کوئی پچیس لاکھ کا بیل ہے، کوئی پانچ لاکھ کا بکرا ہے۔ اِسی طرح بے شمار مختلف مہنگی قیمتوں والے جانوروں کے بارے میں عام آدمی کو حیران اور پریشان کیا جا رہا ہے۔ میں یہ خبریں دیکھ اور سن کر سوچ میں پڑ گیا کہ میرے جیسا مڈل کلاس کیا اس دفعہ قربانی کا جانور خرید سکے گا جس کی لگی بندھی مخصوص آمدن ہے جس میں رہتے ہوئے اُس نے بجلی گیس کے بل، ٹیلی فون کے اخراجات دودھ والے کا ماہانہ بل، ہر دوسرے مہینے پانی کا بل ہر ماہ بچوں کی فیس، روزمرہ کے گھر کے کھانے پینے کے اخراجات، آفس آنے جانے کا کرایا، یا موٹر سائیکل کے پیٹرول کا خرچہ بچوں کیلئے عید کے نئے کپڑے رشتہ داروں کے غمی خوشی پر جانے کے اخراجات سب دینا ہے۔

کبھی غور کریں کہ ہم لوگ بازار سے جو چیز بھی خریدتے ہیں اُس پر ٹیکس دیتے ہیں حتیٰ کے جب ایک تنخواہ دار طبقہ جو کہ سرکاری ملازم ہے اُس کی تنخواہ میں سے ٹیکس پہلے ہی کاٹ لیا جاتا ہے اس کے باوجود جب وہ بازار میں روزمرہ زندگی کی اشیاء خریدنے جاتا ہے تو اُسے ہر چیز پر پھر ٹیکس دینا پڑتا ہے وہ جوتوں سے لے کر سر کے بالوں کی کٹائی ہو یا شادی سے لے کر مرنے والے کے کفن تک کے اخراجات ہوں حتیٰ کے قبر کا بھی ٹیکس دینا پڑتا ہے۔ ہم کیسے معاشرے میں رہ رہے ہیں جہاں پر امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ آپ کو مزے کی بات بتاؤں کہ یہ جو امیر ترین اور غریب ترین کی میں نے سطح بیان کی ہے اِن ٹیکسوں کا ان دونوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا اگر اثر پڑتا ہے تو صرف اور صرف مڈل کلاس یا سفید پوش گھرانے کو پڑتا ہے جو کہ اپنی سفید پوشی کے باعث کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلا سکتا بھلے وہ کتنا ہی تنگ دست کیوں نہ ہو کیونکہ اُس کے اندر

جو حیا، جو انا ہے، جو خودداری ہے، وہ اُسے ایسا کرنے پر راضی نہیں کرسکتی کہ وہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلائے۔ اِن سخت حالات کے باوجود وہ اپنی زندگی کی ٹوٹی پھوٹی گاڑی کو اپنی سفید پوشی کی چادر میں لپیٹے گھسیٹ رہا ہے گرچہ اُس کے پاس نہ ہی بیماریوں کے خلاف جنگ کرنے کی استطاعت ہے نہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی گنجائش ہے نہ ہی خوشحال اور پرسکون گھریلو ماحول اُس کو میسر ہے۔ وہ مسلسل خوف میں زندگی بسر کررہا ہے کہ آج کا دن کیسے گزرے گا کیسے آج گھر میں چولہا جلے گا کیسے بیمار والدین کیلئے دوائیاں لوں گا کیسے بچوں کی فیس ادا کروں گا؟ ایسی بے شمار چھوٹی پریشانیاں جو کہ اُس کے ساتھ ایک آسیب کی مانند لپٹی ہوئی ہیں اور اُسے اندر ہی اندر کھوکھلا کئے جارہی ہیں۔

میرے معاشرے کہ اِس طبقے کو جسے مجھ سمیت مڈل کلاس لوگ کہا جاتا ہے اُن کے مسائل کا حل صرف اور صرف حکومتِ وقت کے پاس ہوتا ہے اُن کا خیال ہوتا ہے کہ حاکم وقت اور نام نہاد جمہوریت سفید پوش طبقے کو آسانیاں پہنچائیں گے اِسی اُمید اور آس پر یہ سفید پوش طبقہ منافق سیاستدانوں کے بہلاوے میں آکر جذباتی نعروں سے ہر دفعہ دھوکہ کھا جاتا ہے مگر ہر دفعہ منافق نام نہاد سیاستدان اُسے بے وقوف بنا کر پانچ سال کیلئے غائب ہوجاتے ہیں اور ہر آنے والا سال اور آنے والے سال کا نیا بجٹ اِس مڈل کلاس طبقے کو مزید مشکلات میں مبتلا کرتا چلا جاتا ہے جس کی بناء پر اس طبقے کے لوگ اور اُن کے بچے جو کہ احساس کمتری کا شکار ہوجاتے ہیں یا تو وہ ڈرگز کی طرف چلے جاتے ہیں یا پھر وہ لوگوں کے موبائل اور پرس چھیننا شروع کردیتے ہیں۔

رب تعالیٰ نے قرآن پاک میں بارہا کہا ہے کہ جو بھی کام کیا جائے وہ اعتدال میں رہ کر کیا جائے میانہ روی کے ساتھ۔ یہاں پر معاشرے میں جو لوگ اس میانہ روی میں زندگی بسر کررہے ہیں اُن کے حالات انتہائی ناگفتہ بہ ہیں۔ اللہ پاک میرے ملک میں مڈل کلاس لوگوں پر اپنا خاص کرم اور عنایت کرے اور اُن کی زندگیوں میں آسانیاں عطا فرمائے۔ آمین

مکالمہ

کچھ عرصہ پہلے میرے اندر بہت زیادہ بے چینی بے صبری اور جلد بازی پائی جاتی تھی کسی حد تک اب بھی میرے اندر ایسے رویئے باقی ہیں۔ میں جو کام بھی کرنا چاہتا ہوں یہ سوچ کر کرتا ہوں کہ جلدی سے ختم کردوں بھلے وہ کھانا کھانا ہو کسی سے ملنے جانا ہو۔ صبح ہو تو دل کرتا ہے کہ شام جلدی ہو جائے، شام ہوتی ہے تو دل کرتا ہے رات جلدی ہو جائے، رات آتی ہے تو جی کرتا ہے کہ یہ بھی جلدی سے گزر جائے اور روشنی ہو جائے۔ میں نے اپنی اس حالت کا ذکر اپنے ایک دوست سے کیا اُس کو بتایا کہ میرے ساتھ کچھ عرصے سے اس طرح کا معاملہ چل رہا ہے تو اُس نے مجھے مشورہ دیا کہ یار تو سرفراز شاہ صاحب سے ایک دفعہ مل کر دیکھ۔ سرفراز شاہ صاحب کا مجھے غائبانہ تعارف تو تھا کیونکہ میں نے ممتاز مفتی کی کتاب ''اوکھے اول لڑے میں'' سرفراز شاہ صاحب کا خاکہ پڑھ رکھا تھا اُس کے بعد شاہ صاحب کے بارے میں ''کہے فقیر کے نام سے'' ایک عدد پروگرام ٹی وی پر بھی دیکھ چکا تھا۔ مجھے میرے اُسی دوست نے بتایا کہ اگر تم نے شاہ صاحب سے ملنا ہے تو وہ ہر سوموار کی دوپہر کو اسلام آباد میں G-6/4 میں تشریف لاتے ہیں اُن سے ملنے کا طریقہ کار یہ ہے کہ تمھیں صبح 9 بجے کے بعد جانا ہوگا وہاں سے تمھیں ٹوکن ملے گا جس پر ایک نمبر درج ہوگا وہ نمبر تمھاری ملاقات کا نمبر ہوگا۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا اور ایک سوموار صبح 9 بجے کے بعد اُس گھر کے باہر چلا گیا جہاں پر شاہ صاحب نے ظہر کی نماز کے بعد لاہور سے تشریف لانی تھی میں نے اپنے حصے کا ٹوکن لیا۔ میرے ٹوکن کا نمبر شاید 113 نمبر تھا۔ مطلب یہ تھا کہ 112 آدمیوں کے بعد میری باری آئے گی۔

جو شخص ٹوکن بانٹ رہا تھا میں نے اُس سے پوچھا بھائی یہ 113 نمبر کتنے بجے تک آجائے گا تاکہ میں اُس وقت آکر بیٹھ جاؤں۔ اُس نے کہا آپ ایسا کیجئے کہ ساڑھے تین بجے کے بعد آیئے گا۔ کیونکہ میرے اندر جلد بازی کا عنصر تھا اس لئے میں اڑھائی بجے ہی وہاں پہنچ گیا، بہت بڑا گھر تھا اُس میں ایک بہت بڑا کمرہ تھا کمرے میں 30 یا 35 کرسیاں لگی ہوئی تھیں اور لوگ اپنے باری کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ باہر برآمدے میں پانی کا ڈسپنسر پڑا تھا کاغذ کے گلاس پڑے تھے خشک

دودھ کے پیکٹ اور ٹی بیگز بھی تھے۔ ہر آنے جانے والا جس کو طلب ہوتی وہ گلاس اُٹھاتا گرم پانی لیتا ٹی بیگ اُٹھاتا اور حسب منشاء خشک دودھ قہوے میں ڈالتا چائے پیتا اور اپنی باری کا انتظار کرتا۔ میں نے بھی ایسے ہی کیا جب میں وہاں پہنچا تو 70 یا 72 نمبر چل رہا تھا تقریباً سوا چار بجے میری باری آئی میں جب کمرے میں شاہ صاحب کے پاس حاضر ہونے کیلئے داخل ہونے لگا تو باہر کھڑے شخص نے کہا کہ آپ نے شاہ صاحب سے صرف ایک سوال پوچھنا ہے اپنے بارے میں اس سے زیادہ نہیں۔

میں دھڑکتے دل سے کمرے میں داخل ہوا تو میرے سامنے ایک کلین شیو پینٹ کورٹ میں ملبوس سر پر بہت کم بال شخص کرسی پر براجمان تھے سامنے ٹیبل پڑا تھا۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا تو وہ مراقبے کے انداز میں بیٹھے ہوئے تھے مجھے کہنے لگے۔ جی حکم، کیا حکم ہے؟ تو میں کہا شاہ صاحب بے چینی بڑی ہے ختم نہیں ہوتی۔ شاہ صاحب نے کہا 10 دن تک روزانہ نماز عصر کے بعد قبرستان میں جاکر بیٹھیں۔ میں کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا مگر مجھے پیچھے سے آواز دی گئی کہ باہر آجائیں۔ جب میں باہر آنے لگا تو شاہ صاحب نے میری طرف ایک ٹافی پھینکی جو میں نے تبرک سمجھ کر اُٹھالی اور گھر واپس آگیا۔ اُس کے بعد میں نے مسلسل 10 دن نماز عصر کے بعد قبرستان جاکر بیٹھنا شروع کردیا پہلے ایک دودن تو مجھے اتنا محسوس کچھ نہ ہوا پھر آہستہ آہستہ میری قبرستان اور قبرستان والوں سے دوستی ہوگئی۔ میں اُس ماحول میں انجوائے کرنے لگا کبھی کسی قبر کے اوپر سے کوئی آوارہ کتا گزر جاتا کبھی کسی بلی کی میاؤں مجھے اچھی لگتی۔ کبھی شام کو درختوں پر پرندوں کے آنے کا وقت اور اُن کی آوازیں سنائی دیتیں۔ مجھے ایسے لگتا کہ یہ شہر خاموش نہیں ہے یہ شہر آباد ہے اور جو اس چاردیواری کے باہر شہر ہے وہ مردہ شہر ہے بے حس ہے بے مروت ہے۔

کچھ ایسا مکالمہ میرے اندر شروع ہوا اُن 10 دنوں نے مجھے بدل کر رکھ دیا۔ پھر وہ 10 دن جب پورے ہوگئے تو میں دوبارہ سرفراز شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے ایک سوال میں اپنا سارا تجربہ بیان کیا اور مجھے مزید ہدایت کی کہ میں نماز اور قرآن خشوع وخضوع کے ساتھ پڑھتا رہوں تاکہ میرے اندر کا انسان زندہ رہے۔

مثبت رویئے

انسان آگ، پانی، مٹی اور ہوا سے تخلیق کیا گیا ہے یہ وہ چار عناصر ہیں جو انسان کے بنیادی کیمیائی مادہ تصور کئے جاتے ہیں۔ آج جو میں آپ سے بات کرنے جا رہا ہوں پتا نہیں آپ کو پسند آئے یا نہ آئے رب تعالیٰ نے اشرف المخلوقات کا درجہ دیا ہے کائنات کی باقی تمام مخلوقات انسان سے کم تر اور انسان کے تابع ہیں اُن میں آپ حشرات العرض لے لیں، جمادات لے لیں، حیوانات لے لیں، نباتات لے لیں، چاند سورج ستارے لے لیں یہ سب کے سب انسان کی پہنچ میں ہیں لیکن انسان کے اندر کی جو دنیا ہے وہ بہت ہی عجیب اور پیچیدہ ہے۔

انسان اپنے اردگرد کے ماحول سے بہت کچھ سیکھتا ہے آج کے دور کا انسان جس کے اندر ہوس، لالچ، حسد، نفرت ہے آج کے دور کا انسان اپنے خونی رشتوں سے لے کر دوست احباب تک کسی کے ساتھ بھی مخلص نظر نہیں آتا خاص طور پر پاکستانی مسلمان جس کے اندر منافقت بھری ہوئی ہے میرے ملک کے انسانوں نے ایک چہرے پر کئی چہرے سجائے ہوئے ہیں مالک، نوکر کو کوئی عزت دینے کیلئے تیار نہیں نوکر مالک کا کام ایمانداری سے کرنے کیلئے تیار نہیں۔ رشتے دار، بہن بھائی ایک دوسرے کی ترقی سے جلتے ہیں کامیابیوں پر حسد کرتے ہیں، آپس میں غیبت کر کے ایک دوسرے کے درمیان جھگڑے کرواتے ہیں بھلے وہ دفاتر ہوں، ملز ہوں، کارخانے ہوں، کھیت کھلیان ہوں غرضیکہ کوئی بھی شعبہ زندگی ایسا نہیں جس میں انسان انسان سے محبت کرے مثبت رویئے رکھے ایک دوسرے کی تکالیف شیئر کرے ایک دوسرے کی ہمت بندھائے اور مثبت سوچ لے کر غریب کا بھلا کرے۔

پورے ملک میں دہرا معیارِ زندگی ہے، عدل و احسان کا رواج بالکل نہیں ظالم طاقتور ہے،

غریب مظلوم ہے، کمزور ہے کوئی ادارہ کوئی انسان نہیں سنتا۔ موجودہ معاشرے میں ہمیں ثقافتی طور پر چند بنیادی رویئے ہندووانہ معاشرے سے بھی ملے ہیں، کہیں بھی شفافیت اور ایمانداری کا رواج نہیں ہے۔ ہم لوگوں کے اندر ایک چیز ہے جو ہم ایمانداری سے کرتے ہیں اور وہ ہے بے ایمانی شاید آپ کو میرے الفاظ کڑوے لگیں سخت لگیں مگر آپ بھی میری طرح اپنے گریبان کے بٹن کھول کر ذرا جھانکیں تو آپ کو پتا لگ جائے گا ہم لوگ کسی کو بھی آسانیاں دینے کیلئے تیار نہیں اگر کوئی تکلیف یا مشکلات میں پھنس جائے تو ہم اُس کی مدد کرنے کی بجائے یہ کہتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے سزا ملی ہے اس کے ساتھ اچھا ہوا جو کچھ بھی ہوا۔ اگر کسی کی اولاد نالائق ہو جائے تو ہم اُس کو دلاسہ دینے کی بجائے خوش ہوتے ہیں دل ہی دل میں کہتے ہیں کہ اچھا ہوا۔

آپ نے کبھی غور کیا کہ اگر کوئی شخص سرراہ چلتا ہوا کیلے کے چھلکے پر سے پھسل جائے تو اُس کے پیچھے آنے والا شخص پہلے زور کا قہقہہ لگائے گا پھر اُس کو اُٹھانے کی کوشش کرے گا۔ معاشرے میں ایسے منفی رویئے بے شمار پھیل چکے ہیں اور اُن کی جڑیں ہمارے جسم اور روح میں خون کی طرح سرایت کر چکی ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ایسی گندی سوچوں اور رویوں کو اپنے اندر سے نکال پھینکیں اور اپنے اندر کے جتنے منفی خیالات یا دوسرے کو تکلیف میں دیکھ کر خوش ہونے والے رویئے ہیں اُن سب سے خود کو آزاد کیا جائے۔ مشکل حالات میں غریبوں، مسکینوں محتاجوں اور قریبی رشتہ داروں کو آسانیاں پہنچائی جائیں، حسن سلوک کیا جائے اُن کی عزت نفس کو مجروح نہ کیا جائے۔ آپ سب سے میری التماس ہے کہ ہم جس طرح اپنے گھر کو صاف رکھتے ہیں اسی طرح اپنے اندر کو بھی صاف کریں تاکہ ہمارا ظاہر اور باطن ایک ہو جائے۔ جس دن ہمیں یہ سمجھ آگئی ہمارا ملک ایک شاندار اور ترقی یافتہ انسانوں کا ہمدرد اور غم خوار ملک بن جائے گا اور ہم ایک قوم ایک ملک ایک کلمہ اور ایک کتاب اور ایک نبیؐ کی تعلیمات پر جمع ہو جائیں گے۔ اللہ ہمیں اپنی رسی کو مضبوطی سے پکڑنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمارے اندر سے تمام گندگیاں نکال دے۔ آمین

نفرت

یہ کیا تماشا ہے خود کو ہم لوگ بڑے مہذب پڑھے لکھے تعلیم یافتہ اور سونے پہ سہاگہ مسلمان کہتے اور سمجھتے ہیں۔ اپنی زبان سے اس کا اقرار کرتے ہیں اور دوست احباب میں بیٹھ کر اس کا پرچار بھی بڑا کرتے ہیں کہ ایک دوسرے کے ساتھ پیار سے پیش آیا جائے ایک دوسرے کی غلطیوں کو خطاؤں کو چاہے وہ دانستہ ہوں یا نہ دانستہ معاف کیا جائے اُن کے ساتھ نرم رویہ اختیار کیا جائے۔ چاہے ہمارا گھر ہو دفتر ہو، دکان ہو کاروبار ہو کوئی بھی زندگی کا پیشہ وارانہ کام ہو جس میں انسان انسان کے ساتھ مل کر کام کرے اور اگر اُس سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو وہ اُس کو ڈانٹے نہیں ہمیشہ اخلاق سے رواداری سے حسن سلوک سے پیش آئے۔ خندہ پیشانی کے ساتھ اپنے غصے کو کنٹرول کرے اور اُس کو نہایت ہی سکون اور اطمینان کے ساتھ سمجھائے کہ بھائی، بیٹا، بیٹی، کوئی بھی شخص ہو اُس کو اچھے طریقے سے یہ باور کروائے کہ آپ سے یہ غلطی ہو گئی ہے براہ مہربانی میرے پیارے آئندہ ایسی حرکت نہ سرزد ہو اور اگر ہو بھی جائے تو آپ نے ایک تو جھوٹ نہیں بولنا اور چھپانا نہیں۔

یہ دو کام کریں گے تو آپ کو مزید مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا آپ سے بھلے بڑے سے بڑا نقصان ہو جائے آپ من وعن اُس کو تسلیم کر لیجئے فوری طور پر معذرت کر لیجئے جب وہ ایسا کر لیں تو پھر آپ کو انھیں معاف کر دینا چاہیے یہ پیغام جو میں آپ سے شیئر کر رہا ہوں اس کا اصل مقصد میرے ملک میں پھیلے تمام شعبوں سے تعلق رکھنے والے خواتین وحضرات کیلئے بھی ہے اُس میں آپ تدریس کا شعبہ لے لیں سرکاری ملازمین لے لیں، پرائیویٹ ملازمین لے لیں ملوں کے

مزدور لے لیں، سکولوں کے طالب علم لے لیں، گھروں میں اپنے بچے لے لیں، رشتہ دار دوست احباب لے لیں، اپنے آپ کو لے لیں اس کا صرف اور صرف مقصد یہ ہے کہ ہمیں کسی بھی انسان اور شعبے سے نہ نفرت کرنی ہے نہ دشمنی۔ شعبہ کوئی بھی ہو بھلے جفت سازی ہو، ترکھان ہو، لوہار ہو، بھنگی ہو، ریڑھی بان ہو، گائیک ہو، راج مستری مزدور ہو، بڑے سے بڑا آفیسر ہو، ممبران اسمبلی ہوں، چوکیدار ہوں، سکیورٹی گارڈ ہوں خاص طور پر پرائیویٹ سکیورٹی کمپنی کے وہ سفید پوش ریٹائرڈ فوجی سکیورٹی گارڈ جو کہ نہایت ہی قلیل ماہانہ آمدنی میں اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتے ہیں سرکاری دفاتر میں لوئر ڈیٹرن، اپر ڈیٹرن کلرک ہوں، نائب قاصد ہوں، ڈرائیور ہوں، ٹرانسپورٹ ہیلپر ہوں ان سب کے ساتھ پیار اور محبت کا رشتہ استوار کریں، حقارت کی نظر سے مت دیکھیں جو Permanent سرکاری ملازمین ہیں وہ اپنے ادارے کے Casual ملازمین یا تھرڈ پارٹی ملازمین کے ساتھ نفرت اور بدتمیزی کا رویہ مت اختیار کریں۔

میں آپ سب سے درخواست کروں گا اور سینئر افسران بالا سے بھی التماس کروں گا کہ دسمبر قریب آ رہا ہے اور اے سی آر Annual Confindential Report کے فارم متعلقہ افسران نے منگوانے شروع کر دیئے ہیں تا کہ دسمبر کے آخر میں وہ اپنے جونیئرز کی اے سی آر جب لکھیں تو لکھیں اُس کے تمام خانے پُر کرتے ہوئے اپنے قلم سے ذاتی عناد اور نفرت کی Very Good سیاہی سے Remarks مت لکھیں بلکہ شفقت اور درگزر کی سیاہی قلم میں ڈال کر اپنے ماتحتوں کی رپورٹس کے تمام خانوں میں Very Good , Good تحریر کریں تا کہ Average اور Below Average لکھیں۔

آپ کے ایک قلم کی جنبش سے اگر کسی انسان کا بھلا ہوتا ہے تو ہو جانے دیجئے اپنی دنیاوی افسری کو نفرت کا لبادہ پہنا کر اور ماتحت کو کم تر تصور کر کے اُس کے مستقبل کو نقصان مت پہنچائیں۔ یاد رکھئے کہ ایک افسر بالا جو کہ ہم سب کا رازق و مالک ہے اُس نے بھی آپکی اے سی آر لکھنی ہے اور اگر وہ جلال میں آ گیا تو پھر آپ نہ دنیا کے رہیں گے نہ دین کے۔ خدارا ہر طبقے کے انسان سے محبت کیجئے نفرت نہ کیجئے۔

پاؤں

چند برس پہلے میں اپنے والد جو کہ اب اِس دنیا میں نہیں ہیں کے ساتھ لیٹا ہوا تھا تو اچانک خیال اُن کے پاؤں پر چلا گیا، میں سوچ میں پڑ گیا کیونکہ اُس وقت والد صاحب کی عمر 85 برس کے قریب تھی۔ میں سوچنے لگا کہ میرے والد کے یہ پاؤں جو کہ پیدائش سے لے کر 85 برس تک اُن کے ساتھ رہے اور یہ پاؤں جو کھردرے تھے تلوے خشکی سے سفید ہو چکے تھے کیونکہ میرے والد کی جلد ڈرائی تھی۔

میں خیالوں خیالوں میں گمان کرنے لگا کہ میرے والد کے پاؤں اس زمین پر کہاں کہاں سے گزرے ہوں گے پھر مجھے ہر انسان کے پاؤں کی اہمیت کا محسوس ہونے لگی، میں سوچ میں پڑ گیا کہ انسانی بدن میں یہ ایسا عضو ہیں جو ہر نیکی بدی میں انسان کا ساتھ دیتے ہیں اگر اُس نے مسجد کی طرف جانا ہے تو اپنے ان دو پاؤں کے بل بوتے پر جانا ہے اسی طرح جب اُس نے برائی کا راستہ اختیار کرنا ہے تو یہ پاؤں ہی اُس کا ساتھ دیتے ہیں بڑی خاموشی کے ساتھ اُس کے تمام خفیہ پوشیدہ ظاہری راستوں کو جانتے ہیں جن جن سے ہر انسان گزرتا ہے اور اپنی زندگی کی مسافت طے کرتا ہے۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ جب انسان پیدا ہوتا ہے تو اُسے گود میں اُٹھا کر لایا جاتا ہے جب چلنے لگتا ہے پہلا قدم اُٹھاتا ہے تو اُس کے ماں باپ کتنے خوش ہوتے ہیں کہ ہمارا بچہ چلنے لگ پڑا ہے خوشی میں کبھی ناریل تقسیم کیے جاتے ہیں کبھی صدقہ دیا جاتا ہے حالانکہ والدین کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اُن کا یہی بچہ بڑا ہو کر انہی قدموں پر راہ راست پر چلے گا یا اپنی غلط کاموں کیلئے اپنے قدموں کا استعمال کرے گا؟

یہ ایسا لمحہ فکریہ ہے جو میں آج آپ کے ساتھ بیان کر رہا ہوں اگر ہم غور کریں نظریں نیچی کر کے قدموں پر نظر جمائیں تو ہمیں بے شمار ایسے غلط کام غلط راستے غلط منزلیں نظر آئیں گی جن پر چلنے کیلئے ہم نے دو قدموں کو استعمال کیا اور اگر ہم مثبت طریقے سے اللہ اور اللہ کے نبیؐ کے بتائے راستوں پر قدم اُٹھا کے چلتے ترقی کرتے تو ہم دنیا میں باعزت مسلم معاشرہ قائم کر سکتے تھے ہمارے اسلاف نے ایسا معاشرہ قائم کیا مگر انکے بعد آنے والوں نے ان دو قدموں کو غلط راستوں پر ڈال دیا پھر ہماری تاریخ ہماری تہذیب ہمارا تمدن سب تنزلی کا شکار ہونے لگ پڑا کیونکہ ہم اور ہمارے قدم بُرے کاموں کی طرف اُٹھنا شروع ہو گئے تھے۔ سپین میں مسلم حکومت کا خاتمہ، برصغیر میں مغلیہ سلطنت کو زوال، ترکی میں سلطنتِ عثمانیہ کا خاتمہ پھر ہم انگریز کے غلام رہے۔

تقسیمِ ہند کے بعد جو ملک ہمیں ملا اُس میں بھی ہمارے بڑوں نے غلط قدم اُٹھائے اُن کے غلط اقدامات کی وجہ سے ہم آج تک کامیاب اور ترقی یافتہ قوم نہیں بن سکے۔ اس تمام کے پیچھے غور کیا جائے شعور کو پرکھا جائے تو اس میں ہمارے اِن قدموں کی آہٹ کا بہت بڑا دخل شامل ہے دنیا کو دیکھ لیں جن اقوام نے اپنے قدم مثبت طور پر استعمال کیئے، اُٹھائے اور چلے کامیابی اُن کا مقدر بنی جبکہ یہی دو قدم جو ہمارے وجود کا حصہ ہیں اِن دو قدموں کو دو پاؤں کو اگر ہم اور ہمارے ملک کا ہر فرد سیدھے راستے پر ایمان کے راستے پر لے کر چلے تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہم لوگ بڑے خوش قسمت لوگ ہوں گے۔

آیئے عہد کریں کہ اس سے پہلے ہمیں جنازے کی ڈولی میں اُٹھا کر قبر تک پہنچایا جائے سب سے پہلے میں خود امین کنجاہی اپنے ان دو قدموں کو مثبت طور پر عملی زندگی میں اُٹھایا کروں گا۔ باقی آپ سب سے میری التماس ہے کہ آیئے ہم سب اپنے اپنے قدموں کو صراطِ مستقیم کی طرف لے جائیں اور اپنی دنیا اور آخرت سنوار لیں۔

پیار

آج میرے کالم کا موضوع پیار ہے میں اپنے تمام پڑھنے والوں سے توقع رکھتا ہوں کہ وہ بھی میرے اِس کالم کو بہت زیادہ پیار سے پڑھیں گے۔ آپ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکان مجھے محسوس ہو رہی ہے مسکرائیں نہیں کھل کر ہنسیں کیوں کہ آپ کو پتا ہے پیار کا مفہوم بہت وسیع ہے اس کی بے شمار شاخیں ہیں اور اس کی کوئی حد نہیں۔ پیار جب بھی جس سے جیسے ہوتا ہے بے انتہا دیوانگی کے ساتھ ہوتا ہے یہ دیوانگی ایسی نہیں کہ انسان سب بھول جائے یہ وہ دیوانگی ہے جس میں انسان کو اپنے پیارے یاد رہتے ہیں اور یہ وہ پیارے ہوتے ہیں جو اُس کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتے ہیں۔

آج جس پیار کی شاخ کے بارے میں آپ سے بات کرنے جا رہا ہوں وہ خوبصورت احساس ہے جو آپ کو پہلی دفعہ کسی بھی اپنے پیارے کو ایک نظر میں دیکھتے ہی ہو جاتا ہے اِس پیار میں رب تعالیٰ روح سے روح کا تعلق استوار کرتا ہے اُس میں لفظوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی کیونکہ آنکھ جو کچھ بولتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں۔ یہ وہ احساس ہوتا ہے کہ آپ اپنے پیار کو جس کے ساتھ آپ کا ایک لمحے میں صدیوں کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے اور جس کو ایک نظر دیکھنے کیلئے آپ 24 گھنٹے بے چین بے تاب پھرتے ہیں کروٹیں بدلتے ہیں اور اس ہجر اور فراق کے ذائقے کو جب محسوس کرتے ہیں تو آپ کا پیار اور زیادہ والہانہ ہو جاتا ہے۔

پیار ایک نشے کی طرح آپ کی پوری شخصیت کو اپنے حصار میں لے لیتا ہے اور آپ اپنے پیار کے مدار میں نظام شمسی کی طرح طواف کرنے لگتے ہیں پھر آپ کے روز و شب گراں گزرتے ہیں اور آپ ہر لمحہ اپنے محبوب اپنے پیارے کی یاد میں منہمک رہتے ہیں بھلے آپ سوئے ہوں، جاگے ہوں کوئی کام کر رہے ہوں مگر آپ کا دھیان اُس محبوب سے نہیں ہٹتا۔ آپ مسلسل اسی تگ و دو میں رہتے ہیں کہ کسی طرح محبوب کا قرب حاصل کریں اُس کی سانسوں کی آہٹ کانوں کے قریب محسوس کریں آپ اپنے محبوب سے تنہائی میں مکالمہ کرتے ہیں اور یہ مکالمہ آپ کی متاعِ عزیز بن جاتا ہے آپ اِس محبت میں سرشار ہو کر دنیا کا مشکل سے مشکل ترین کام کرنے سے بھی نہیں ڈرتے

کیونکہ پیار ایک ایسا جذبہ ہے ایک ایسی کو ملتا جو آپ کے اندر قوس قزح کے رنگ بکھیر دیتی ہے زندگی سے پیار کرنا زندگی گزارنے کا وصف سکھا دیتی ہے آپ کے اندر صبر برداشت در گزر کرنا آجاتا ہے غصہ کم ہو جاتا ہے آپ دینے والی پوزیشن میں آجاتے ہیں اور اپنے محبوب کیلئے کچھ بھی قربان کرنے کیلئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جب سب کچھ آپ کیلئے آپ کا محبوب ہوتا ہے اور ہاں آپ کو مزے کی بات بتاؤں کہ ہم جس سے پیار کرتے ہیں اُس کی تمام خامیوں اور خوبیوں سمیت کرتے ہیں، مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے پیارے کو کوئی تکلیف نہ دیں اُس کیلئے زندگی وقف کر دیں اُس کی زندگی میں جو جو رکاوٹیں دشواریاں مشکلات یا مسائل ہوں انھیں کم سے کم کیا جائے اور اُس کو احساس بھی نہ ہونے دیا جائے۔ خاموشی سے پیار امر ہوتا رہے کوئی بھی دو پیار کرنے والوں کے درمیان حائل نہ ہو نہ دنیاوی طور پر نہ مادی طور پر نہ ہی روحانی طور پر۔ پیار وہ لطیف جذبہ ہے جو معصوم دلوں کی چھوٹی چھوٹی خواہشوں سے پنپتا ہے پھر دیکھتے ہی دیکھتے زندگی گلزار بن جاتی ہے۔ اس گلزار میں صرف ایک موسم رہتا ہے اور وہ موسم ہوتا ہے بہار کا رنگینیوں کا بسنتی رنگوں کا خوشیوں کا جس میں غموں پر بھی خوشی کا اظہار ہوتا ہے اپنے پیاروں کے غم بھی پھولوں جیسے ہوتے ہیں اُن کا غصہ کلیوں کی طرح ہوتا ہے جن میں وفا کی خوشبو حیا کی زبان ہوتی ہے رسوائی کا ڈر نہیں ہوتا۔ جنون اور عشق انسان کو اپنے پیار تک پہنچنے میں مدد دیتے ہیں۔

یہی کہنا ہے کہ آپ بھی اپنے اردگرد ایسے پیاروں کو تلاش کریں اُن کی قدر کریں، محبت کریں، عزت دیں، ٹھیس نہ پہنچائیں اُن کے دکھوں پر پردہ ڈالیں، عیبوں کو بے نقاب نہ کریں فقط پیار وفا اور محبت ہی سے دل جیتا جا سکتا ہے۔ پیار ماں بچے سے بھی کرتی ہے، اُستاد شاگرد سے بھی کرتا ہے بہن بھائی سے کرتی ہے مگر جس پیار کی بات میں آپ سے کرنے جا رہا ہوں وہ بے لوث ہے جس میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر پیار کرنے کا سلیقہ اپنانا چاہیے، پوری دنیا میں محبت اور پیار کو عام کرنا ہے نفرتوں کو کم سے کم کرنا ہے۔ ہم تمام خرابیاں یک دم ختم تو نہیں کر سکتے ہاں مگر پیار سے سب کم ضرور کر سکتے ہیں۔

رمضان

روزے کے بارے میں اللہ پاک کا فرمان ہے کہ روزہ میرے اور مومن کے درمیان ہے اور میں ہی اِس کی جزا دوں گا۔ رب نے ماہِ صیام کو سب سے افضل ترین عمل قرار دیا ہے اور اِس کا ثواب رب کہتا ہے میں دوں گا۔

آج آپ سے رمضان کے حوالے سے ہی بات کرنی ہے ہمارے ملک میں جب رمضان کی آمد شروع ہوتی ہے تو اشیائے خورونوش کی قیمتیں آسمانوں پر چلی جاتی ہیں، آلو پیاز سے لے کر کپڑوں کی خریداری تک ہر چیز کی قیمتیں ڈبل بلکہ ڈبل سے بھی زیادہ کر دی جاتی ہیں اور اُن پر کسی کو کوئی کنٹرول حاصل نہیں ہوتا کہ ایسا نہ کیا جائے مہنگائی کے اِس اژدھے کو روکا جائے تا کہ وہ غریب آدمی کو نہ ڈس لے مگر ایسا نہیں ہوتا۔ ہمارے ملک میں رمضان کے دنوں میں پورا ایک مہینہ غریب آدمی غربت میں رہتے ہوئے روزے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں مگر بڑی ہی مشکل میں جبکہ دنیا کے دیگر مسلم ممالک میں رمضان کے دنوں میں ہر چیز سستی کر دی جاتی ہے اور وافر مقدار میں لوگوں میں تقسیم کی جاتی ہیں۔ مگر ہمارے ملک میں اُلٹا نظام ہے کاروباری حضرات کہتے ہیں کہ سال میں ایک یہی مہینہ تو ہے کمائی کا کہ جس میں سال کی آمدن پوری کرنی ہوتی ہے۔ یہ کیسی سوچ ہے یہ کیسا رجحان ہے؟

ہم مسلمان ہیں اس کے باوجود ہمارے اندر دین سے محبت اور نرمی کیوں نہیں پیدا ہوتی ہم لوگوں میں صلہ رحمی اور درگزر کا احساس کیوں نہیں جاگتا ہم سخت دل کیوں بن جاتے ہیں۔ ہمارا دین دین فطرت ہے اُس نے ایک دوسرے کے ساتھ پیار محبت کا درس دیا ہے ایک دوسرے کو معاف

کرنے کا درس دیا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو اپنے قریبی رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے ساتھ حسن سلوک کا عملی ثبوت بھی دیا اور ہمیں ہدایت کی کہ ہم لوگ باحیثیت مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ پیار محبت اور خوش اسلوبی کے ساتھ زندگی بسر کریں اپنے ہمسایوں کا خیال رکھیں اور اُن کو عزت دیں۔ حضور اکرمؐ نے تو اِس حد تک ہمسائے کے بارے میں حکم دیا کہ صحابہ کرامؓ کو یہ ڈر پیدا ہو گیا کہ کہیں وراثت میں بھی ہمسائے کیلئے حصہ نہ مقرر کر دیں۔ مگر بڑے افسوس کی بات ہے کہ آج ہم جس مسلم معاشرے میں زندگی بسر کر رہے ہیں اُس میں ہمیں اپنے بہن بھائیوں کا تو دور کی بات ہمسائے کی خبر نہیں ہوتی کہ اُس کے گھر میں کوئی تکلیف کوئی پریشانی کوئی بیماری کوئی مالی مشکلات تو نہیں۔

اب تو یہ ہوتا ہے کہ جب صبح اُٹھیں تو پتا چلتا ہے کہ ہمسائے میں کسی کی فوتگی ہو گئی ہے اور باہر کرسیاں لگائی جا رہی ہیں ہم اِس حد تک اپنے گھروں میں محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہم رمضان کا مہینہ عبادتوں میں نہیں گزارتے ساری رات سحری تک جاگتے رہتے ہیں پھر سحری کر کے سارا دن سوئے رہتے ہیں۔ نوجوان نسل روزے اِس طرح سے رکھتی ہے جب صبح اُٹھتی ہے ظہر کے بعد تو کوئی غیر ملکی فلم ڈرامہ یا سیزن لگا کر اپنا روزہ بہلانے کا سامان پیدا کرتی رہتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں ایسا روزہ روزہ نہیں ہے کہ جس میں صرف بھوکے رہنا مقصود ہو اور کوئی باقی دین کا عمل مکمل نہ کیا جائے۔ اگر ہم نے صرف بھوکا پیاسا رہنے کو ہی روزہ سمجھ رکھا ہے تو یہ بہت سخت بھول ہے میں اپنے تمام کاروباری بھائیوں سے بھلے وہ ریڑھی بان ہوں یا ملوں کے مالک درخواست کروں گا کہ آپ لوگ ماہ رمضان میں عام آدمی کیلئے سستی چیزیں مہیا کریں سستے پھل مارکیٹ میں لائیں، غریب کی چمڑی مت اُتاریں۔ ایسے رمضان کا کوئی فائدہ کوئی ثواب آپ کو نہیں ملے گا بلکہ اُلٹا عذاب اور گناہ ملے گا۔ اللہ ہمیں اِس ماہ رمضان کو آسانی سے گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

رشتۂ ازدواج

جناب میرے قارئین کرام آج آپ میرے کالم کے عنوان پر تھوڑے حیران ہوئے ہوں گے، پریشان بھی۔ زیرِلب مسکرا بھی رہے ہوں گے رب تعالیٰ نے جب آدم کو مٹی سے بنایا ایک روایت کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام کئی سو برس تک اللہ سے معافی مانگتے رہے اور پھر رب تعالیٰ نے اُن کی معافی قبول کر لی، پھر نسلِ آدم کا سلسلہ شروع ہو گیا جو آج تک جاری ہے اِس ساری تمہید کا مقصد صرف اتنا ہے اور وہ یہ کہ رب تعالیٰ نے کائنات میں انسان سے انسان کا اگر کوئی پہلا رشتہ بنایا یا قائم کیا یا جوڑا تو وہ میاں بیوی کا رشتہ ہے۔ گو کہ قرآن پاک میں رب تعالیٰ نے بار بار اپنے بندوں کو والدین کے ساتھ نرمی سے پیش آنے کا حکم دیا ہے اور یہاں تک فرمایا ہے کہ اگر تمہارے والدین دونوں یا دونوں میں سے ایک بزرگی کی عمر میں پہنچ جائے تو اُنھیں اُف تک نہ کہو کیوں کہ وہ تمہارے لئے بہت زیادہ محترم ہیں۔

آپ ذرا غور کیجئے کہ رب تعالیٰ نے کتنی حکمت کے ساتھ میاں بیوی کا رشتہ قائم کیا پھر اُن کو اولاد کی نعمت سے نوازا۔ پھر والدین کے دل میں اپنے بچوں سے محبت کا جذبہ پیدا کیا انہوں نے اپنے بچوں کو شیر خوارگی کی عمر میں گرمی سردی سے بچایا اور جب بچے جوان ہوئے تو اپنے والدین سے

بغاوت کرنے لگ پڑے۔ نا جانے کب سے یہ ہوتا آ رہا ہے بچے والدین کی نافرمانی کرتے رہیں گے اور والدین اپنے بچوں کے ساتھ پیار محبت اور درگزر کا رویہ اختیار کرتے رہیں گے۔

بہت کم والدین آج کے دور میں ایسے ہیں جن کے بچے اُن سے محبت اور احترام کا رشتہ قائم رکھے ہوئے ہیں مگر ایک بات جو میں آپ کے ساتھ کرنے جا رہا ہوں وہ یہ ہے کہ رب نے سب سے پہلے میاں بیوی کا رشتہ بنایا ہے۔ جب بچے جوان ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے والدین کو چھوڑ دیتے ہیں پھر آخر میں وہی میاں بیوی دونوں اکٹھے رہ جاتے ہیں بھلے اُن کے 12 بچے ہوں 14 بچے ہوں 2 بچے ہوں یا ایک بچہ۔ پھر بھی آخر میں اکیلے ہی دونوں میاں بیوی کو رہنا ہے یہ واحد رشتۂ ازدواج ہے جو کہ نہ ختم ہونے والا رشتہ ہے لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم لوگ اپنی اپنی بیویوں اور ہماری بیویوں کو چاہیے کہ وہ اپنے اپنے خاوندوں کے ساتھ خوشی غمی میں اکٹھے رہیں کبھی یہ مت سوچیں کہ ہم علیٰحدہ ہو جائیں یا ایک دوسرے کو چھوڑ دیں کیونکہ رب نے جو رشتہ بنایا ہے اُس کو بہت عزیز ہے ہمیں بھی چاہیے کہ ہم بطور میاں بیوی اِس رشتے کو احسن طریقے سے نبھائیں۔

رواداری

موجودہ دور میں ہمارے معاشرے میں سب سے زیادہ شدت سے کمی محسوس ہوتی ہے برداشت اور رواداری کی ، ہم لوگ اگر اپنے اندر جھانکیں اور تھوڑی دیر کیلئے سوچیں اپنے رویوں کے حوالے سے تو یہ شدت سے احساس ہو گا کہ ہمارے اندر رواداری کی مقدار بہت کم ہو گئی ہے۔

یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ہمارے بدن میں کبھی کبھی مختلف وٹامنز کی کمی واقع ہو جاتی ہے ڈاکٹر ری کمنڈ کرتا ہے کہ دودھ زیادہ پئیں تاکہ آپ کی ہڈیاں زیادہ مضبوط ہوں ، وٹامن ڈی کی کمی ہو تو وہ کہتا ہے کہ دھوپ میں زیادہ دیر بیٹھیں۔

اسی طرح ہمارے جسم کی بیماریاں ہیں جنکے علاج کیلئے ہمیں کسی نہ کسی ڈاکٹر کے پاس جانا پڑتا ہے پھر وہ ہمیں کچھ ٹیسٹ لکھ کر دیتا ہے کہ یہ کروالیجئے پھر دیکھتے ہیں آپ کے اندر کیا مسئلہ چل رہا ہے پھر وہ ٹیسٹ دیکھ کر دوائی تجویز کرتا ہے اور دوائی کھانے کا وقت متعین کرتا ہے۔ پھر کہتا ہے آپ ایک ہفتے یا دس دن کے اندر دوبارہ چیک کروالیجئے گا اور ہم خوشی خوشی گھر آ جاتے ہیں کہ علاج شروع ہو گیا ہے۔

کچھ بیماریاں مثبت ہوتی ہیں کچھ منفی ۔ میں آپ کا زیادہ ٹائم نہیں لینا چاہتا ، آپ کو مشکلات میں نہیں ڈالنا چاہتا زیادہ بھاری الفاظ کا استعمال نہیں کرنا چاہتا ، نہ ہی آپ کی رواداری کا امتحان لینا چاہتا ہوں کیونکہ یہ ہمارے معاشرے میں بہت کم باقی رہ گئی ہے۔ آپ کے ساتھ دل کی باتیں

کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم سب ایک جیسے ہیں۔نوجوانوں میں آگے بڑھنے کا شوق ہوتا ہے زندگی کو اچھے طریقے سے گزارنے کی اُمنگ ہوتی ہے، میں تو زندگی کے کافی سیڑھیاں طے کر چکا ہوں آپ نے ابھی بہت لمبا سفر طے کرنا ہے اس لئے میں اپنے تجربے کے حوالے سے کچھ باتیں کروں گا کوشش یہ کروں گا کہ میرے اور آپ کے درمیان جنریشن گیپ نہ ہو۔ میں رواداری سے آپ سے بات کروں گا اور رواداری سے چلوں گا اور آپ نے رواداری سے میری بات کو سننا ہے۔ یہ محبت ہوگی کہ آپ میری بات دھیان سے سنیں میں چند برسوں سے مختلف یونیورسٹیوں میں جاتا ہوں، مکالمہ کرتا ہوں، آپ لوگوں سے کچھ سیکھ کر آتا ہوں آج میں نے آپ سے کچھ سیکھنا ہے وہ ہے رواداری، صبر۔

ہر انسان کا مزاج اپنا اپنا ہے جس طرح ہم سب کے فنگر پرنٹس ایک دوسرے سے نہیں ملتے ہماری سوچیں ایک دوسرے سے نہیں ملتیں، رویئے ایک دوسرے سے نہیں ملتے، اساتذہ اور تعلقات ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اندر رواداری کم ہو رہی ہے اور اس کا علاج یہ ہے کہ اُس کا علاج ہم نے اپنے سے شروع کرنا ہے اپنے اندر صبر پیدا کرنا ہے برداشت کا مادہ زیادہ رکھنا ہے مثبت سوچ اور اچھے خیالات کو اپنے اندر جگہ دینی ہے، منفی سوچیں کم کرنی ہیں مثبت رویوں کو زیاہ بڑھانا ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ مکالمہ رکھنا ہے رابطہ رکھنا ہے موجودہ حالات ہمیں جس طرف لے کر جا رہے ہیں اُس میں مجھے کہیں بھی رواداری نظر نہیں آتی نفسا نفسی کا عالم ہے۔

آپ روز صبح اُٹھتے ہیں یونیورسٹی جانا ہے سمسٹر پورا کرنا ہے کام کرنا ہے مشین کی طرح۔آپ کی پڑھائی کا مقصد صرف اور صرف یہ ہے کہ آپ نے پڑھ کر نوکری کرنی ہے کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ ماں باپ نے پیسہ لگایا ہے اور میں نے اپنی زندگی کو ایک خاص ماحول میں گروی رکھ دینا ہے دنیاداری اور مارکیٹنگ کی دوڑ میں گم ہو جانا ہے۔اتنی باتیں کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہر کام کا ایک معیار، مقدار ہوتی ہے اگر خوراک زیادہ کھالیں تو بیمار ہو جائیں گے اور اگر خوراک کم کھائیں تو تب بھی بیمار ہو جائیں گے اس کیلئے آپ کو اپنی زندگی میں توازن قائم رکھنا پڑے گا۔اور توازن کیلئے

دینِ اسلام میں فرمایا ہے کہ جو بھی کام کرو میانہ روی سے کرو جلد بازی نہ کرو بے صبری نہ کرو ناشکری نہ کرو وقتی طور پر خواہشات کے مطابق زندگی میں نتائج آپ کو نہیں ملتے تو اُس پر آپ نے پریشان نہیں ہونا۔

زندگی مسلسل چلتے رہنے کا نام ہے آپ بھلے کتنے بھی کوشش کرلیں میں مثال دوں گا کہ اگر آپ کا کوئی بہت زیادہ قیمتی نقصان ہوگیا ہے اور آپ بہت زیادہ ڈپریشن میں چلے گئے ہیں تو مایوسی آپ پر حاوی ہو جائے گی مگر وہ لمحے زیادہ عرصہ آپ پر قائم نہیں رہیں گے۔ کبھی آپ نے دیکھا ہے ضعیف بوڑھا شخص 80 یا 85 برس کا شخص بستر مرگ پر پڑا ہے آپ اُس کی تیمارداری کرنے جاتے ہیں تو وہ آپ سے اُس وقت بھی کہے گا دُعا کریں میں ٹھیک ہو جاؤں۔ یہ زندگی کی جو خواہش ہے اس کو ہم نے قائم رکھنا ہے رواداری جو ہمارے اندر ہے اُس کی مقدار بڑھانی ہے وہ کیسے بڑھانی ہے وہ آپ نے اور میں نے مل کر اپنے رویئے تبدیل کرنے ہیں۔ آپ کو میں ایک مثال کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں کہ ماشاء اللہ ہم سب گاڑی چلانا جانتے ہیں گاڑی آج کے دور کی ایک ضرورت بھی ہے مگر کبھی آپ نے یہ محسوس کیا کہ آپ جب گاڑی چلا رہے ہوں تو آپ کے پیچھے آنے والی گاڑی کا ڈرائیور آپ کو ڈپر مارے کہ آپ اس کو راستہ دے دیں تاکہ وہ آپ سے آگے نکل سکے تو آپ کتنا بُرا محسوس کرتے ہیں کہ یہ کون ہوتا کہ جو مجھے پیچھے سے ڈپر مار رہا ہے میں اپنی لین میں جا رہا ہوں میں اسے راستہ کیوں دوں حالانکہ اگر آپ اس کو راستہ دے دیں اور اپنی گاڑی کو سائیڈ پر کرلیں تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے نہ ہی اس میں ہماری کوئی بے عزتی ہے مگر جو ہمارے اندر کی منفی سوچ اور کمینگی ہے وہ ہمیں ایسا کرنے سے روکتی ہے۔ اور کہتی ہے نہیں نہیں اس کو راستہ نہیں دینا پہلا حق میرا ہے یہ وہ روح کی بیماریاں ہیں جن کی میں آپ کو نشاندہی کرنا چاہ رہا ہوں جس میں کہ حسد، بغض، کسی کی کامیابی پر ناخوش ہونا شامل ہے کیونکہ ہمارے اندر حوصلہ ظرف نہیں ہے کہ ہم نے دوسرے کی کامیابی کو دوسرے کو آگے جانے سے روکنا ہے اور یہ ہمیں کسی طور بھی پسند نہیں کہ بھلے کوئی ہم سے کتنا ہی بہتر کیوں نہ ہو ہم اُسے آگے بڑھنے سے روکیں گے۔

آپ اسے جو بھی کہہ لیں یہ ہمارے اندر ہے، ہم ہر کام جلدی کرنا چاہتے ہیں اُس میں شارٹ کٹ

ڈھونڈتے ہیں، اپنے اندر صبر نہیں پیدا کرتے مشقت نہیں کرنا چاہتے اپنے حصے کی خواری نہیں کاٹنا چاہتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جب گھر سے باہر نکلیں تو گاڑی پر نکلیں ہمیں ٹیکسی رکشہ بس ویگن پر بیٹھنا توہین محسوس ہوتا ہے۔

اسی طرح تھوڑا اور غور کریں کہیں بھی دفاتر میں چلے جائیں تو آپ چاہیں گے کہ آپ کا کام سب سے پہلے ہو جائے اس کیلئے کوئی سفارش ڈھونڈیں گے، جاننے والا ڈھونڈیں گے کہ یار کوئی ملے تو میرا کام جلدی ہو جائے مجھے لائن میں نہ لگنا پڑے کھڑا نہ ہونا پڑے۔ اس طرح کے چھوٹے چھوٹے بے شمار واقعات آپ کو اپنے اندر ملیں گے رویئے ملیں گے کہ جن میں ہم رواداری کا مظاہرہ کر سکتے ہیں مگر ہم نہیں کرتے۔ یہی وہ وجوہات ہیں کہ جن کی بنیاد پر آج تک ہم ایک قوم کی بجائے ہجوم کی مانند ہیں جن کے اندر جذبات کی شدت بہت زیادہ ہے، ایسا کیوں ہے اس چیز کو ہم نے بیٹھ کر سوچنا ہے تلاش کرنا ہے اپنی روح کے اندر سے کمینگی کی جڑی بوٹیاں نکال باہر پھینکنی ہیں ایک ایسے انسان کی صورت اختیار کرنی ہے جو دوسرے کو نقصان نہ دے، دوسرے کے ساتھ خیر کا تعلق قائم کرے۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو اپنے راستے میں سے پتھر اُٹھانے کو بھی رواداری کا حصہ قرار دیا ہے۔

پھانسی اور پارٹی

پاکستان پیپلز پارٹی کو قائم ہوئے پورے 50 برس ہو گئے ہیں اس پارٹی کا آغاز بھی بڑا ڈرامائی انداز میں ہوا، تاریخ کا بغور جائزہ لیں تو ہم سب اچھی طرح جانتے اور سمجھتے ہیں کہ 1967ء میں جب ذوالفقار علی بھٹو جنرل ایوب خاں کی کابینہ میں وزیر خارجہ تھے۔ 1966ء میں جب جنگ ستمبر کے بعد روس کے شہر تاشقند میں پاک، بھارت حکمرانوں کے درمیان معاہدہ طے پایا جس کے تحت پاکستانی افواج جو کہ کشمیر اور مشرقی پنجاب کی طرف کافی حد تک بھارتی علاقے پر قبضہ کر چکی تھیں تو اُس وقت کے بھارتی وزیر اعظم لعل بہادر شاستری بہت سٹ پٹائے انہوں نے بھارت کی امداد کیلئے نا صرف یو این او بلکہ روس کی حکومت کو مدد کیلئے بلایا اس کے نتیجے میں پاکستان کے اُس وقت کے صدر جنرل محمد ایوب خان اور اُس وقت کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو اور بھارتی وزیر اعظم لال بہادر شاستری کو تاشقند میں مدعو کیا دونوں ملکوں کو مذاکرات کے میز پر لا کر بٹھایا اِس معاہدے کو معاہدہ تاشقند کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اِس معاہدے کے تحت پاکستان نے وہ تمام علاقے خالی کر دیئے جو افواج پاک نے جنگِ ستمبر 1965ء میں قبضے میں لئے تھے، اس معاہدے کے تحت پاک، بھارت افواج جنگ سے پہلے والی اپنی سرحدوں پر واپس آ گئیں اِس بات سے مشتعل ہو کر پاکستان کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے ایوب کابینہ سے استعفیٰ دے دیا اور اپنی الگ سیاسی پارٹی بنانے کا اعلان کر دیا جس کا نام پاکستان پیپلز پارٹی رکھا گیا اس سیاسی پارٹی کا منشور روٹی کپڑا اور مکان تھا اس کی طاقت کا سرچشمہ عوام تھے اور اس پارٹی کا نظریاتی جھکاؤ

چین کی سوشلسٹ پارٹی اور لیڈروں کی طرف زیادہ تھا اُن میں ماؤزے تنگ اور اُس وقت کے چینی وزیراعظم چوئن لائی شامل تھے۔

پاکستان پیپلز پارٹی 1967ء سے لیکر 1970ء کے انتخابات تک ایک عوامی تحریک کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ 03اکتوبر 1958ء کو جنرل ایوب خان جو کہ اُس وقت آرمی چیف بھی تھے اور سکندر مرزا کی کابینہ میں وزیر دفاع بھی تھے انھوں نے پاکستان میں پہلی دفعہ مارشل لاء لگا دیا اور 1956ء کے آئین کو منسوخ کر دیا پھر ایوب کابینہ میں 1959ء میں پہلی دفعہ ذوالفقار علی بھٹو پانی اور بجلی کے وزیر بنائے گئے یہی ذوالفقار علی بھٹو ایوب خان کو ''ڈیڈی'' بھی کہا کرتے تھے ایوب خان کے بڑے قریبی ساتھیوں میں ان کا شمار ہوتا تھا مگر معاہدہ تاشقند کے اختلاف پر بھٹو نے پیپلز پارٹی بنائی 1970ء کے الیکشن میں اِس پارٹی نے مغربی پاکستان بالخصوص پنجاب اور سندھ میں اکثریتی پارٹی کی شکل اختیار کی جبکہ مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن کی سربراہی میں عوامی لیگ نے مکمل طور پر اکثریت حاصل کی۔

1970ء کے الیکشن کے مطابق جمہوری طور پر وزیراعظم بننے کا حق شیخ مجیب الرحمٰن کا تھا مگر 1971ء کی پاک بھارت جنگ میں سقوط ڈھاکہ کی شکل میں مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش کے نام سے دنیا کے نقشے پر نمودار کروا دیا گیا اِس میں سب سے بڑا کردار ہمارے ہمسایہ ملک بھارت کا تھا باقی بچا کچھا پاکستان پیپلز پارٹی کے حصے میں آ گیا جس کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو بن گئے اسی پیپلز پارٹی کے دور میں 1973ء کا آئین متفقہ طور پر بنایا اور منظور کیا گیا اِس آئین کے تحت چاروں صوبوں کو جمہوری اختیارات دیدیئے گئے مگر بدقسمتی سے ذوالفقار علی بھٹو اور اُن کی پارٹی کے لوگوں نے پنجاب، سندھ کے علاوہ باقی دو صوبوں بلوچستان اور کے پی کے پر زیادہ توجہ نہ دی اِن صوبوں کو جمہوری طور پر احساسِ محرومی کا شکار ہونا پڑا اور پھر 07 مارچ 1977ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی نے اپوزیشن جماعتوں کے قومی اتحاد کے خلاف اسمبلی میں دو تہائی اکثریت حاصل کر لی مگر قومی اتحاد کی اپوزیشن جماعتوں نے الیکشن کے نتائج ماننے سے انکار کر دیا جس کی بناء پر پورے ملک میں تحریک نظام مصطفیٰ کا آغاز ہو گیا۔

06 جولائی 1977ء کی درمیانی شب اپوزیشن جماعتوں اور پیپلز پارٹی کے درمیان جبکہ معاہدہ طے پاچکا تھا اُس وقت کے آرمی چیف جنرل ضیاء الحق نے پیپلز پارٹی کی حکومت کو برطرف کردیا، 1973ء کے آئین کو معطل کردیا گیا اور 90 دن کے اندر ملک بھر میں دوبارہ عام الیکشن کروانے کا وعدہ کیا گیا مگر پھر حالات نے رُخ بدلا۔ احمد رضا قصوری کے والد کے قتل کا مقدمہ درج کرکے ذوالفقار علی بھٹو کو گرفتار کرلیا گیا، اُس وقت کے لاہور ہائیکورٹ کے جسٹس مولوی مشتاق حسین نے بھٹو کو سزائے موت کا حکم سنا دیا پھر مقدمہ سپریم کورٹ میں اپیل کیلئے پیش کیا گیا تو فاضل جج صاحبان نے بھٹو کی سزائے موت کو بحال رکھا۔ پورے عالم اسلام اور مسلم دنیا سے اپیلیں کی گئیں کہ بھٹو کو سزائے موت نہ دی جائے جلاوطن کردیا جائے یا عمر قید کی سزا دے دی جائے مگر اُس وقت کے آرمی چیف جنرل ضیاء الحق نے یہ سب ماننے سے انکار کردیا۔ پھر 04 اپریل 1979ء کو پیپلز پارٹی کے پہلے چیئرمین کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا پھر 11 وقت نے دیکھا کہ 11 برس تک ملک میں آمریت کرنے والے ضیاء الحق 17 اگست 1988ء کو سانحہ بہاولپور میں ایک ہوائی حادثے میں مارے گئے، اس وقت تک پیپلز پارٹی کی جڑیں عوام میں بہت گہری ہوچکی تھیں، عوام نے 1988ء کے الیکشن میں پیپلز پارٹی کی چیئرپرسن محترمہ بےنظیر بھٹو کو پہلی خاتون وزیراعظم ہونے کا اعزاز بخشا، بینظیر بھٹو کی شادی آصف زرداری سے ہوگئی۔ 27 دسمبر 2007ء کو بےنظیر بھٹو کی شہادت کے بعد 2008ء کے الیکشن میں آصف علی زرداری ملک کے صدر منتخب ہوگئے اور پورے پانچ سال حکومت کی۔ اسی طرح 2013ء کے الیکشن میں جب آصف علی زرداری نے اپنی مدت صدارت پوری کرلی تو ایک بزنس مین خاندان نے ملک پر حکومت کرنا شروع کردی اور وہ حکومت ابھی تک چل رہی ہے۔ اس دوران پیپلز پارٹی کے جیالے اور عام کارکن جو کہ بھٹو اور بےنظیر بھٹو پر اپنی جانیں قربان کرنے کو تیار رہتے تھے اور جس پارٹی کو ضیاء جیسا ڈکٹیٹر بھی ختم نہ کرسکا وہ اب اندرونِ سندھ تک محدود ہوکر رہ گئی ہے۔ ان 50 برسوں میں پیپلز پارٹی کا سفر جو ذوالفقار علی بھٹو سے شروع ہوا تھا وہ بلاول بھٹو زرداری پر آکر ختم ہوتا نظر آرہا ہے۔

تحمل

آج صبح میں 7 بجے اپنے کام کیلئے گھر سے نکلا، میرا یہ معمول ہے کہ گاڑی چاندنی چوک سے موڑ کر اسلام آباد جاتا ہوں آج جب حسب معمول میں نے اپنی گاڑی چاندنی چوک سے فیض آباد کی طرف موڑی تو ابھی چند میٹر ہی گیا ہوں گا کہ پیچھے سے آنے والی ایک گاڑی نے ہیڈ لائیٹس مارنی شروع کر دیں۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ ایک انسانی فطرت ہے کہ اگر کوئی اِس قسم کی حرکت کرے تو جو آگے گاڑی والا ہوتا ہے اُس کو غصہ آجاتا ہے وہ گاڑی کو راستہ دینے کیلئے تیار نہیں ہوتا۔ آج صبح میری بھی یہی کیفیت تھی میں نے طے کیا اس کو راستہ نہیں دینا کیونکہ میں مناسب رفتار کے ساتھ اپنی لائن میں گاڑی چلا رہا تھا مگر وہ گاڑی والا مسلسل ڈپر دیئے جا رہا تھا میرا اور اُس کا یہ سلسلہ فیض آباد تک جاری رہا۔ پھر اچانک مجھے میرے دل نے ملامت کرنا شروع کر دیا کہ تم یہ کیا حرکت کر رہے ہو تم تو بہت مثبت رویوں کی بات کرتے ہو اندر سے کمینگی کو ختم کرنے کا درس دیتے ہو تم بھی عام آدمی والی حرکت پر اُتر آئے ہو۔

میں نے فوری اُلٹے ہاتھ کا اشارہ لگایا اور گاڑی والے کو راستہ دیدیا جب گاڑی والا میرے قریب سے گزرا تو اُس نے نہایت غصے کے ساتھ دیکھا جس پر مجھے ندامت ہوئی میں نے جلدی سے دونوں ہاتھ جوڑنے کی کوشش کی تاکہ معذرت کر سکوں مگر وہ فراٹے بھرتا ہوا بہت آگے نکل گیا۔

اِس سارے واقعے کو بیان کرنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ ہمیں اپنے اندر کی میل کو صاف کرنا ہے چھوٹے چھوٹے رویئے جنھی انا کا مسئلہ نہ بنایا جائے تو سب ہنسی خوشی نا صرف گھروں میں بلکہ

بازاروں میں سڑکوں پر آتے جاتے راستوں میں ایک دوسرے کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں۔لہٰذا آج میں نے اپنے دل سے یہ عہد کیا ہے کہ آئندہ کے بعد جو بھی کوئی مجھ سے پیچھے ہوگا میں اُس کو راستہ دے دیا کروں گا بھلے زندگی کا کوئی بھی میدان ہو، سڑک ہو، گلی ہو، محلہ ہو، کوچہ ہو عملی زندگی میں مجھے جہاں جہاں بھی آگے بڑھنے کا موقع ملا اور میں نے یہ محسوس کیا کہ میرے آگے بڑھنے سے میرے پیچھے آنے والوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے تو میں نہایت ادب و احترام کے ساتھ اپنے پیچھے آنے والوں کو راستہ دے دیا۔اِس کو کبھی بھی عزتِ نفس کا مسئلہ نہیں بنایا یہی وہ باتیں ہیں اور یہی وہ رویئے ہیں کہ جن پر چل کر ہم لوگ اپنے معاشرے کو پرامن پر سکون اور ترقی یافتہ بنا سکتے ہیں۔

ایک بات اور میں آپ لوگوں سے شیئر کرنا چاہ رہا ہوں وہ یہ کہ موجودہ معاشرے میں سچ ناپید ہوگیا ہے اور جھوٹ کی کثرت ہوگئی ہے تو کیوں نہ آیئے ایک مہم شروع کرتے ہیں، اُس مہم کا بنیادی خیال یہ ہونا چاہیے کہ ہم روزانہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں اپنے کاروبار میں اپنے لین دین میں اپنے ناپ تول میں جھوٹ بولنا کم کریں گے۔روزانہ اِس ایک جھوٹ میں ایک جھوٹ جمع کرتے جائیں گے پہلے دن ایک جھوٹ کم کریں گے، دوسرے دن دو، تیسرے دن تین اور چوتھے دن چار اور ہر روز سونے سے پہلے ہم بہت دھیان کے ساتھ اپنا احتساب کریں گے۔دیکھیں گے کہ ہماری زندگی میں کتنے جھوٹ کم ہوئے ہیں ہم کس حد تک سچ کے قریب ہوئے ہیں، یہ سارا کام بہت صبر آزما ہے اِس کیلئے ہمیں درگزر، برداشت اور تحمل کی اشد ضرورت پیش آئے گی اس لئے ہمیں چاہیے کہ اس کام کو جہاد سمجھ کر اپنائیں اپنے نفس پر قابو کرنا سیکھیں تاکہ نا صرف ہم انفرادی طور پر سچے اور کھرے انسان بن سکیں۔ایسا کرنے میں ہم لوگ کامیاب ہو جاتے ہیں تو یقین مانئے کہ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جھکا نہیں سکے گی۔

رب کی مرضی

آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ انسان جب دنیا میں آتا ہے اپنے والدین کے تعاون سے تو اُس وقت والدین شکر ادا کرتے ہیں۔ بیٹی ہو تو کہا جاتا ہے کہ اللہ کی رحمت ہمارے گھر ہوئی ہے بیٹا ہو تو کہا جاتا ہے کہ اللہ کی نعمت ہمارے گھر آئی ہے۔ پھر ماں باپ اپنے بچے کیلئے اور اُس کی زندگی کیلئے محنت اور دُعائیں کرنا شروع کر دیتے ہیں یہ سلسلہ نسلوں سے یونہی چل رہا ہے اور نا جانے کب تک یونہی چلتا رہے گا قدرت کے کارخانے میں نا جانے کتنے مٹی کے بت اور روحیں جمع ہیں جو دنیا کی آبادی میں اضافہ کئے جا رہا ہے جو کہ اس بات کا ثبوت ہے کہ رب ابھی تخلیق آدم سے مایوس نہیں ہوا اور شاید ابھی پوری کائنات آدم نے مسخر کرنی ہے۔ اسی لئے ابھی تک کائنات کا نظام چل رہا ہے سورج روز طلوع ہوتا ہے مغرب میں غروب ہوتا ہے، ستارے چمکتے ہیں چاند نکلتا ہے پھر اماوس کی راتیں آجاتی ہیں اور یہ سلسلہ یونہی چل رہا ہے۔

انسان جب بھی کوئی بڑا کارنامہ انجام دیتا ہے یا کوئی کامیابی حاصل کرتا ہے تو سینہ تان کر اور بڑے جوش وجذبے کے ساتھ اعلان کرتا ہے ساری دنیا کو باور کرواتا ہے کہ یہ کامیابی یہ کامرانی میری ہے میں نے یہ کام کیا ہے مجھے اس پر بڑا فخر ہے اس کے بہن بھائی رشتہ دار دوست احباب بھی اس پر فخر کرنے لگتے ہیں مگر جب کوئی کام انسان کی منشاء اور مرضی کیخلاف ہو جائے اُس کو اپنی زندگی، اپنے کاروبار، اپنے مال ودولت اور جائیداد میں نقصان اُٹھانا پڑ جائے تو وہ اس کا ذمہ دار اللہ کو قرار دے دیتا ہے۔ جو بھی کوئی اُس کے پاس آتا ہے اُس سے پوچھتا ہے کہ بھائی جی یہ کیسے ہوا تو کہتا ہے جی! اللہ کی مرضی اللہ کی طرف سے ایسا ہی لکھا تھا۔ آپ نے غور کیا کہ انسان کتنا چھوٹا اور کم ظرف ہے جب کامیابیاں رب تعالیٰ عطا کرتا چلا جاتا ہے تو بھول جاتا ہے کہ یہ کامیابیاں بھی اُسے رب عطا کر رہا ہے اس میں اُس کا کوئی عمل دخل نہیں۔ یہ بات بھول جاتا ہے کلام پاک میں آیا ہے رب تعالیٰ نے فرمایا کہ انسان سب سے زیادہ قریب اُس وقت میرے ساتھ ہوتا ہے جب وہ سمندر کے اندر طوفان میں گھرا ہوا اور اُس کی کشتی ہچکولے کھا رہی ہو تو وہ اپنے رب کو بڑے ہی

ایمان اور خلوص دل سے پکارتا ہے اور پھر جب اُس کا رب اُسے خیر و عافیت سے طوفان سے باہر لے آتا ہے تو وہ اپنے رب سے پھر دور ہو جاتا ہے، یہ سمجھتا ہے کہ اب مجھ پر کوئی مصیبت اور مشکل نہیں پڑے گی مگر یہ اُس کی خام خیالی ہوتی ہے انسان کو ہر حال میں یقین کامل ہونا چاہیے کہ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے اُس میں رب کی رضا رب کی اطاعت ضرور شامل ہونی چاہیے، اُس کے اندر اپنے رب کے احکامات ماننے اور سمجھنے کی صلاحیت ہونی چاہیے۔ اُس کو دعا کرنی چاہیے کہ اے اللہ مجھے اپنے نیک بندوں میں شامل کر توفیق عطا فرما کہ میں تیری مخلوق کی خدمت کرسکوں، بھلائی کے کام کرسکوں۔ بندے کو ہر حالت میں رب کا شکر گزار ہونا چاہیے اُس کے اندر تکبر اور رعونت پیدا نہیں ہونی چاہیے۔

آپکو مزے کی بات بتاؤں، شاید آپ ماننے کیلئے تیار نہ ہوں بات یہ ہے کہ ایک ایسی صفت ہے جو کہ رب کے پاس نہیں ہے اور وہ صفت ہے عاجزی کیونکہ رب کبھی عاجز نہیں ہوسکتا وہ عاجزی اپنی مخلوق اور انسانوں میں دیکھنا چاہتا ہے اور اُس نے بارہا یہ فرمایا ہے کہ اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ، رشتہ داروں کیساتھ، دوستوں کیساتھ، غریبوں کے ساتھ، یتیموں کیساتھ، مسکینوں کیساتھ، عاجزی سے ملا کرو کیونکہ رب کو ایسے انسان محبوب ہیں جو انسانوں کے ساتھ عاجزی سے پیش آئیں اُن سے پیار محبت عفو درگزر کریں اور اُن کی غلطیوں پر اُن کے عیبوں پر پردہ پوشی کریں جس طرح رب اپنے انسانوں کے گناہوں کو پردے میں رکھتا ہے وہ یہ وصف اپنی مخلوق میں بھی دیکھنا چاہتا ہے تاکہ معاشرے میں تمام دنیا کے انسان بھلے وہ کسی بھی دین مذہب رنگ نسل سے ہوں اُن کے بیچ میں آپسی بھائی چارہ پیار محبت اور اعتماد قائم رہے تاکہ دنیا کا نظام رب کی منشاء کے مطابق چلتا رہے نا کہ انسان کی اپنی غلط کاریوں کی وجہ سے پوری کائنات کو نقصان اُٹھانا پڑے۔ پھر وہ یہ کہتے پھریں کہ یہ تو اللہ کی مرضی تھی، انسان ہمیشہ اپنے غلط فیصلوں اور غلط اعمال کی وجہ سے نقصان اُٹھاتا ہے رب تعالیٰ کبھی بھی کسی انسان کو نقصان نہیں دیتا کیونکہ وہ تو 70 ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والا ہے۔

ٹِک ٹِک

دسمبر کا آخری عشرہ شروع ہو چکا ہے وقت کتنی تیزی سے گزر رہا ہے سال میں 12 ماہ 365 دن اور 52 ہفتے ہوتے ہیں ہر دن میں 24 گھنٹے اور اِن گھنٹوں میں انسان اپنی روزمرہ کی زندگی کو لمحہ لمحہ تقسیم کرتا رہتا ہے۔

حیلے بہانوں سے بچپن میں چند سال ہی ہوتے ہیں جو انسان لاپرواہی بے خوفی اور خوشی سے گزارتا ہے اور وہ سال ہوتے ہیں شیر خوارگی سے لے کر سکول جانے سے پہلے تک۔ جب انسان سکول میں داخل ہو جاتا ہے تو پھر چل سو چل ایک نہ رکنے والا ایسا کٹھن سفر جس میں بے تحاشا دشواریاں، ذہنی اذیتیں، مالی مشکلات، تعلیمی رکاوٹیں، بیماریاں اور بے شمار مسائل، ایک ایسی دلدل جس سے پھر وہ کبھی باہر نہیں نکل پاتا بھلے کتنی ہی کوشش کرے۔ دنیاداری کے دھندے اور جھمیلے اُسے اس دلدل سے باہر نہیں نکلنے دیتے وہ مکمل طور پر غلام زندگی گزارتا ہے، ایسی غلامی جو مرتے دم تک قائم رہتی ہے۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں کیسی باتیں لکھ رہا ہوں جو جو حضرات مجھے پڑھ رہے ہیں وہ اپنے سکول کے پہلے دن کو یاد کریں اب تک کی زندگی پر ایک سرسری سی نظر دوڑائیں تو آپ کو لگ پتا جائے گا۔ طالب علم حضرات اپنی تعلیمی اور روزمرہ کی زندگی کو دیکھیں پرکھیں اور سوچیں اِسی طرح بہن بھائی رشتہ دار دوست احباب والدین آپ کے افسران بالا آپ کے ماتحت حضرات اور بے شمار خواتین و حضرات جو اس دنیا کے میلے میں ریس کی طرح دوڑے چلے جا رہے ہیں اور جن کا مقصد صرف اور صرف دنیاوی اور مادہ پرست دنیا کے لئے اپنی روزمرہ کی زندگی جس کو کہ مشینی رنگ دے دیا گیا ہے اور جس میں کوئی لذت کوئی سکون کوئی آسانی نہیں جو کہ ہمیں روحانی طور پر میسر ہو۔

ہم لوگ کولہو کے بیل کی طرح اور گدھوں جیسی زندگی گزار رہے ہیں دنیاداری میں مگن ہو چکے ہیں اور دنیاداری کے سوداگروں نے پوری دنیا کو ایک اتوار بازار بنا کر رکھ دیا ہے۔ جس میں ہر طرح کا

سامان دستیاب ہے اگر دستیاب نہیں ہے تو وہ انسان سے انسان کی محبت، صبر کرنا، برداشت کرنا درگزر کرنا، معاف کرنا، خوشیاں بانٹنا، دُکھ کم کرنا یہ وہ احساسات ہیں جو ہمیں اِس دنیا کے پورے بازار میں کہیں نہیں ملتے۔ ہم مکمل طور پر ایسے مجمعے میں پھنس چکے ہیں جس میں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا کبھی کبھی دنیا مجھے سرکس کی طرح لگتی ہے جس میں لوگ ایک بہت بڑے ٹینٹ کے نیچے بیٹھ کر شیر، چیتا، بندر اور کتے کو چھوٹی سی سائیکل چلاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ کبھی کبھی ایک بہت بڑے پہیے والی سائیکل پر ایک آدمی بیٹھا ہوا نمودار ہوتا ہے کبھی لڑکیاں اور لڑکے جمناسٹک شروع کر دیتے ہیں خطرناک قلابازیاں لوگوں کو دکھاتے ہیں یہ سرکس تقریباً 3 گھنٹے پر محیط ہوتا ہے پہلا گھنٹہ بچپن کی طرح لگتا ہے دوسرا گھنٹہ جوانی تیسرا اور آخری گھنٹہ بڑھاپا ہے جس میں کہ انسان نے آخر تک رہنا ہے۔ بچپن اور جوانی آکر گزر جاتے ہیں مگر بڑھاپا بڑا وفادار ہوتا ہے وہ قبر تک ساتھ دیتا ہے۔

آپ بھی سوچ میں پڑ گئے ہوں گے کہ میں کس طرف لے آیا۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ دسمبر پھر ختم ہونے جا رہا ہے 2018ء کی آمد آمد ہے سب لوگ 25 دسمبر کو بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناحؒ کا یوم پیدائش منائیں گے باقی تمام دنیا میں ہمارے پاکستان سمیت کرسچین بھائی بہنیں کرسمس کا تہوار منائیں گے اور نئے سال کی آمد کا جشن بھی منایا جائے گا۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ وہی ہفتے کے سات دن سوموار سے شروع ہونا اتوار کو ختم ہو جانا۔ اِس دوران میرے اور آپ سب کے کمروں میں لگے وال کلاک کی ٹِک ٹِک ہمیں کتنی خاموشی کے ساتھ چپکے چپکے دبے پاؤں قبر کی طرف لے کر جا رہی ہے اور ہمیں اِس کا احساس تک نہیں ہو رہا اگرچہ اِس دوران پت جھڑ کے پتوں کی طرح بہت سے دوست احباب رشتہ دار ہم کھو چکے ہیں ٹِک ٹِک ٹِک جاری ہے۔

اللہ کرے کے آنے والا وقت تمام دنیا بالخصوص ہمارے ملک کیلئے امن سکون اور محبت کا پیام لائے۔ آمین

تربیت

اچانک بیٹھے بیٹھے ذہن میں خیال آیا کہ آج کے دور کے بچے جو تعلیم حاصل کر رہے ہیں یہ اُس تعلیم سے بہت بہتر ہے جو ہم اپنے دور میں حاصل کیا کرتے تھے۔ ہمارے دور میں انگلش کا مضمون چھٹی جماعت سے شروع ہوتا تھا جس میں A for Apple اور B for Baby جیسے الفاظ بتائے جاتے تھے ہم کلاس میں زمین پر بوری کے ٹاٹ پر بیٹھا کرتے تھے جب بڑی کلاسوں میں گئے تو اساتذہ نے گھر سے پیڑی لانے کی اجازت دیدی۔ ہم گھروں سے اپنی اپنی پیڑی لے کر سکول جایا کرتے تھے۔ گاؤں سے میٹرک کر کے شہروں کی طرف کالجوں میں داخلہ لینے نکل جاتے کوئی لاہور گورنمنٹ کالج چلا جاتا، کوئی ایف سی کالج چلا جاتا، کوئی آرمی میں سلیکٹ ہو جاتا، کوئی کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور چلا جاتا کوئی UET یونیورسٹی سے انجینئر بن کر نکلتا، کوئی سی ایس ایس کا امتحان پاس کرتا اور پاکستان کی ٹاپ بیوروکریسی میں چلا جاتا۔

آج جب ہم بچوں کا موازنہ اپنے بچپن اور جوانی سے کرتے ہیں اور تعلیمی معیار جو کے ہمارا انتہائی سادہ اور دیہاتی ماحول پر مبنی تھا اور جس میں "مولا بخش" کا سب سے زیادہ رول ہوتا تھا۔ آج جب ہم موجودہ دور میں اپنے بچوں کی تعلیم پر نظر دوڑاتے ہیں تو بہت حیرانگی ہوتی ہے آج کے دور کی مائیں بچوں کو تین ساڑھے تین سال کی عمر میں پلے گروپ میں داخل کروا دیتی ہیں اتنی کم عمری میں سکول جانے سے بچے میں چڑچڑاپن آجاتا ہے، ماں سے دوری کا غم اُسے پریشان کر دیتا ہے یہ وہ عمر ہوتی ہے جس میں بچے کو ماں کی ممتا کی انتہائی اشد ضرورت ہوتی ہے مگر آج کی مائیں جلد از جلد اپنے بچوں کو سکولوں میں داخل کروا دیتی ہیں اور پھر وہ تین ساڑھے تین سال کی عمر کا بچہ اگلے سولہ سترہ سال تک تعلیم سے نبرد آزما رہتا ہے۔ اس میں کچھ بچے کامیاب انسان بن جاتے ہیں بہت زیادہ بچے نالائق رہ جاتے ہیں گو کہ موجودہ دور میں سکولوں کالجوں میں گرمیوں میں اے سی ہوتے

ہیں سردیوں میں ہیٹر چلتے ہیں یہ ساری ظاہری شوشا کسی حد تک بچے کو احساس برتری کا احساس تو دلاتی ہے مگر ایک کامیاب بھائی، باپ اور شہری نہیں بنا سکتی۔ بڑی بڑی عمارتوں میں زیادہ فیسیں ادا کرنے سے آپ بچے کو کاغذ کی ڈگری تو دلوا سکتے ہیں مگر اُس کی صحیح تربیت نہیں کروا سکتے اصل چیز تعلیم کے ساتھ جو سب سے زیادہ ضروری بچے کی تربیت ہے اور بچے کی سب سے پہلی تربیت گاہ اُس کا گھر اُس کے ماں باپ ہوتے ہیں۔

بچے کے پہلے 8 سال انتہائی قیمتی ہوتے ہیں اِس عمر میں بچہ وہ سب کچھ اپنے اندر جذب کر رہا ہوتا ہے جو اُس نے آگے چل کر عملی زندگی میں دنیا کو واپس لوٹانا ہوتا ہے۔ جب ہم بچے ہوا کرتے تھے تو رات کو سونے سے پہلے اپنے ماں باپ کے درمیان لیٹ جایا کرتے تھے، والد ہمیں ہر رات ایک کہانی سنایا کرتے تھے اور وہ کہانی قرآن پاک کے واقعات پر مشتمل ہوتی تھی کبھی حضرت موسیٰؑ کا قصہ، کبھی حضرت عیسیٰؑ کا قصہ، کبھی حضرت یوسفؑ اور کبھی واقعہ معراج النبیؐ۔ ہم خوشی خوشی اور جذباتی ہو کر سنا کرتے تھے پھر ہمارے والدین اسلامی اور مسلم ہیروز کے واقعات سنایا کرتے جن میں چاروں خلفاء راشدینؓ، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، طارق بن زیاد، نورالدین زنگی، صلاح الدین ایوبی، حیدر علی اور ٹیپو سلطان شامل ہوا کرتے تھے مگر آج کے دور میں بڑے دکھ سے یہ لکھنا پڑ رہا ہے کہ آج کے بچوں کو اور اُن کے والدین کو مسلم تاریخ اور ہیروز کے بارے میں کچھ پتا نہیں آج کے دور کے نصاب سے بھی ان تمام ہیروز کی کہانیاں اور واقعات نکال دیئے گئے ہیں آج بچوں کے ہیروز سپائیڈر مین، سپر مین، بیٹ مین اور ہیری پوٹر ہیں جب ہم اپنی نئی نسل کو اپنے اسلاف کے بارے میں نہیں بتا سکیں گے یا نہیں بتائیں گے تو ہم پھر کیسے اپنے مستقبل کو تابناک بنا سکتے ہیں یہ ہمارے لئے اور ہمارے حکمرانوں کیلئے لمحہ فکریہ ہے۔

اُدھار

زندگی میں روزمرہ ہر شخص کسی نہ کسی صورت میں یا تو اُدھار لیتا ہے یا دیتا ہے آپ اس کو پورے معاشرے میں دیکھیں اور سمجھیں تو تمام دنیا لین دین کے حوالے سے اُدھار پر چل رہی ہے آپ سوچ رہے ہوں گے وہ کیسے اُس کو اس طرح بتانا چاہتا ہوں کہ جتنا دنیا کا بزنس ہو رہا ہے چلے دنیا پرمت جائیں اپنے ملک میں دیکھ لیں اپنے صوبے میں دیکھ لیں شہر میں دیکھ لیں گلی محلوں میں دیکھ لیں کہ تمام کا تمام لین دین کھانے پینے کی اشیائے خورونوش کپڑے اور کریڈٹ کارڈز اور ڈیبڈ کارڈز ہیں یہ تمام کہ تمام اُدھار ہیں آج سے 100 سال پہلے 80 سال پہلے آپ چلے جائیں تو برصغیر پاک و ہند میں ساہوکار ہوا کرتے تھے جو کہ سود پر یا کچھ قیمتی زیورات یا زمین رہن رکھ کر قرضہ دیا کرتے تھے اور اُس کے بدلے میں سود یا بیاج لیا کرتے تھے۔ جو بھی بندہ ایک دفعہ ساہوکار کے پاس چلا جاتا تو پھر وہ نسل در نسل اس قرضے کو ادا نہ کر پاتا۔

اس نظام کی جدید اور موجودہ شکل آپ کو بینکوں میں ملے گی جو بینک لوگوں کو قرضہ دیتے ہیں اس کے بدلے ان سے 16 فیصد 17 فیصد یا کبھی اس سے بھی زیادہ سود اصل رقم پر وصول کرتے ہیں اور جن کو ادا کرنے میں کئی برس لگ جاتے ہیں۔ یہی نظام ہمارے زرعی شعبے میں بھی ہے لوگ سرکار سے اپنی زمین گروی رکھ کر بیج اور کھاد کیلئے قرضہ لیتے ہیں۔ قرضہ بہت بری لعنت ہے اگر انفرادی طور پر آپ سے کسی نے اُدھار لیا ہو یا لینا ہو تو آپ سے وہ وعدے کرے گا قسمیں کھائے گا اور کہے گا کہ مجھے میری ضرورت کے مطابق قرض دے دیں تو میں ایک مدت کے بعد آپ کے پیسے لوٹا دوں گا جب آپ اُس کو ضرورت کے مطابق قرض دیدیتے ہیں اور پھر جب مقررہ مدت پوری ہو جاتی ہے تو آپ واپسی کا تقاضا کرتے ہیں تو وہ حیلے بہانے کرتا ہے کبھی کہتا ہے ہفتے تک دیدوں گا کبھی کہتا ہے دس دن ٹھہر جائیں کبھی کہتا ہے میرا چیک آنے والا ہے کبھی کہتا ہے کمیٹی نکلنے والی ہے حتیٰ کہ آپ نے جو رقم اُس کے مشکل وقت میں اپنی طرف سے ادا کی ہوتی ہے وہ اُسے

دینے کیلئے تیار اور رضامند نہیں ہوتا۔ تعلقات اور دوستیوں پر اس کا بہت بُرا اثر پڑتا ہے مگر وہ شخص جس کو کے آپ نے مشکل وقت میں آسانی پہنچائی ہوتی ہے وہ آپ کیلئے مسلسل دردسر بن جاتا ہے آپ کبھی اپنے دوستوں کے ذریعے سے کبھی اپنے مشترکہ رشتہ داروں کے ذریعے سے اُسے کہلواتے ہیں کہ برائے مہربانی مجھے پیسوں کی اشد ضرورت ہے میرے پیسے لوٹا دیں مگر نہ ہی تو وہ انکار کرتا ہے کہ میں نے پیسے نہیں دینے اور نہ ہی پیسے واپس کرتا ہے فقط اُمید اور آس دلاتا ہے کہ میرا ذرا ہاتھ سیدھا ہو جائے تو انشاء اللہ! اللہ کے حکم سے میں آپ کی پائی پائی ادا کردوں گا آپ فکر نہ کریں اور بار بار پیسوں کا تقاضا کر کے شرمندہ نہ کریں، آپ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے ہیں۔

یہی حال دیکھا جائے تو ملکوں کا بھی ہے جیسے ہمارا ملک آئی ایم ایف سے قرض لیتا ہے اور مقررہ مدت تک جب پیسے لوٹا نہیں پاتا تو اس پر سود در سود اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے پھر سود دینے کیلئے بھی قرضہ لینا پڑتا ہے۔ ہم لوگ اپنی چادر میں رہتے ہوئے اپنے اخراجات کیوں پورے نہیں کرتے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر کسی کے ساتھ لین دین کرو تو لکھ لیا کرو اور اگر کسی انسان کے بارے میں اُس کے کردار کو پرکھنا ہو تو اُس کے ساتھ یا تو سفر کرو یا اُس کو قرضہ دے کر دیکھو اگر ان دونوں کاموں میں وہ آپ کے ساتھ اچھا رویہ رکھتا ہے تو وہ مومن شخص ہے اور اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو منافقین میں سے ہے۔

اللہ ہمیں سوائے اپنی ذات کے کسی اور کا محتاج نہ کرے بلکہ ہمیں توفیق دے کہ ہم لوگ اپنے سے کمتر اور ضرورت مند لوگوں کا خیال رکھیں اُن کی مدت کریں اُن کے بچوں کی تعلیم وتربیت میں اُن کے ساتھ تعاون کریں۔ یتیموں، مسکینوں محتاجوں اور بیواؤں کے ساتھ حسن سلوک کے ساتھ پیش آئیں تاکہ ہماری آخرت سنور جائے۔ اللہ ہم سب کو ایک دوسرے کا بوجھ اُٹھانے اور ایک دوسرے کیلئے آسانیاں پیدا کرنے کا سلیقہ عطا فرمائے۔ آمین

وقت

سورۃ العصر میں رب تعالیٰ نے وقت کی قسم کھائی ہے اور قرآن پاک میں بارہا جگہ پر رب تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وقت کو بُرا مت کہو کیونکہ وقت میں ہوں، یعنی رب ہے، اس لئے اکثر اوقات ہم لوگ اپنی روزمرہ زندگی میں ایک دوسرے سے اپنے حالات و واقعات بیان کرتے ہوئے بڑی بے باقی سے کہہ دیتے ہیں کہ یار وقت بہت بُرا آ گیا ہے، بُرا وقت چل رہا ہے وقت دھوکا دے گیا، ہمیں ایسے الفاظ ادا کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔

کبھی اکیلے میں بیٹھے اور غور کریں وقت کے تسلسل کو، اگر آپ کے گھر میں باپ، بیٹا اور پوتا موجود ہیں تو یہ 3 وقت ہیں 3 نسلیں ہیں ماضی حال اور مستقبل تینوں آپ کے پاس ہیں۔ یہ وقت کے تسلسل کی ایک کڑی ہے اسی طرح آپ تھوڑا اور غور کریں تو وقت آپ کو بہتا ہوا محسوس ہوگا جیسے ایک پرسکون دریا اپنی منزل کی جانب رواں دواں رہتا ہے، وقت بھی کبھی کبھی مجھے پانی کی طرح لگتا ہے جو بہتا رہتا ہے روکا نہیں جا سکتا اُس نے آخر جا کر سمندر میں گرنا ہوتا ہے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے آج میں کس قسم کی بات کر رہا ہوں جی بات تو میں وقت کی کر رہا ہوں وقت کبھی ایک سا نہیں رہا۔

ایک مختصر سا واقعہ یاد آ رہا ہے پرانے زمانے میں ایک بادشاہ ہوا کرتا تھا اُس نے اپنے وزیر باتدبیر سے پوچھا کہ کوئی ایک ایسا جملہ بتاؤ جو میری زندگی کیلئے کارآمد ثابت ہو سکے تو وزیر نے بادشاہ کو ایک انگوٹھی بنوا کر دی اُس انگوٹھی پر لکھا ہوا تھا یہ وقت بھی گزر جائے گا۔ بادشاہ بڑا حیران ہوا اور کہا اس کا مفہوم بتاؤ کہ تم نے مجھے ایسا جملہ کیوں لکھوا کر دیا؟ وزیر نے کہا، بادشاہ سلامت یہ میں نے اس لئے لکھوایا ہے کہ آپ کی زندگی میں اگر کوئی سخت اور مشکل مقام آیا تو آپ اس انگوٹھی کی طرف نظر ڈال لیا کیجئے گا اور جب آپ انتہائی خوشی اور مسرت کے لمحات میں ہوں تو اُس وقت بھی یہ جملہ پڑھ لیا کیجئے یہ آپ کو تمام زندگی یاد دلاتا رہے گا کہ کبھی بھی وقت ایک جیسا نہیں رہتا۔

اپنے گردونواح میں دیکھیں تو بے شمار لوگ ہمیں چھوڑ کر جا چکے ہیں کبھی گزر قبرستان سے ہو تو آپ کو محسوس ہوگا کہ یہ بے شمار لوگ جو قبروں کے اندر مدفون ہیں کبھی یہ میری اور آپ کی طرح زندہ ہوا کرتے تھے کوئی کسی کا باپ تھا، بھائی تھا، بیٹا تھا، کوئی ماں تھی، کوئی بہن تھی، کوئی بیٹی تھی۔

بے شمار لوگ اس دنیائے فانی سے کوچ کر چکے ہیں مگر وقت کا دریا ہے کہ بہتا ہی چلا جا رہا ہے نہ اُس کی روانی میں کوئی فرق آیا اور نہ ہی کوئی حد اور فصیل اس کی راہ میں حائل ہو سکی۔ وقت چلتا جا رہا ہے لمحہ لمحہ دن بدن ہفتہ وار ماہانہ سالانہ اور صدیوں تک پھیلا ہوا وقت ایک نا ختم ہونے والے سلسلے میں چل رہا ہے ہم لوگ بھی اسی وقت کے بہاؤ میں بے رہے ہیں اور ایک دن اچانک ایسا لمحہ آئے گا جب ہم لوگ اپنے پیاروں سے بڑی خاموشی کے ساتھ جدا ہو جائیں گے جیسے کے ہمارے پیارے ہم سے بڑی خاموشی کے ساتھ جدا ہو گئے۔ یہ سلسلہ نسل درنسل سے چل رہا ہے اور نسل درنسل تک چلتا رہے گا وقت کو کوئی نہ تو قید کر سکا ہے اور نہ ہی کبھی قید کر سکے گا اُس نے چلتے رہنا ہے۔ روز سورج طلوع ہوتا ہے شام آتی ہے رات ہو جاتی ہے مگر وقت نہیں رکتا وقت مسلسل سفر میں ہے جو سورج مشرق سے نکلتا ہے وہ مغرب میں غروب ہوتا ہے جو مغرب سے طلوع ہوتا ہے وہ مشرق والوں کیلئے غروب ہو جاتا ہے مگر وقت چلے جا رہا ہے یہ ازل سے چل رہا ہے اور ابد تک یوں ہی چلتا رہے گا۔

اس وقت نے بے شمار تہذیبوں کو بنتے دیکھا تباہ ہوتے دیکھا پھر نئے دور کے ترقی کرتے انسانوں کو دیکھا۔ قرآن پاک میں بے شمار امتوں کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے جنہیں وقت کی رفتار نے نیست و نابود کر دیا۔ آج کے دور کا انسان جو کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں انتہائی مہارت حاصل کر چکا ہے شاید اُس کو یہ علم نہیں ایک وقت ایسا آئے گا کہ جب وہ بھی قصۂ پارینہ بن جائے گا۔ اِس لئے ہمیں چاہیے کہ وقت کی قدر کریں اپنے بچوں کو اور اپنے بڑوں کو وقت کی عزت کرنا سکھائیں کیونکہ اگر ہم نے وقت کی قدر نہ کی تو پھر ہمیں سوائے پچھتاوے کے کچھ نہیں ملے گا کیونکہ وقت ہی سب کچھ ہے وقت کے دن اور رات وقت کے کل اور آج وقت کی ہر شے غلام وقت کا ہر شے پہ راج۔

زبان

بات نکلے گی تو دور تلک جائے گی یہ شاعری یہ گیت آپ نے بے شمار دفعہ سنا ہوگا اور سر بھی دُھنا ہوگا کیونکہ اس کی شاعری میں جو گداز ہے اس کے گانے والے کی آواز میں جو مٹھاس ہے ساری تمہید کا جو مقصد ہے بیان کرنے کا وہ یہ ہے کہ ہم لوگ جو بولتے ہیں اُس میں کتنی طاقت ہے جس کی آپ سب سے بڑی مثال یہ دیکھ لیں کہ ہمارے بزرگوں نے بے شمار مقام پر تشریح کے ساتھ بیان کیا ہے وہ یہ کہ خنجر اور گولی کا لگا زخم مندمل ہو سکتا ہے مگر زبان سے نکلے الفاظ اور کمان سے نکلا ہوا تیر کبھی واپس نہیں آتے۔ خاص طور پر زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کی جو شدت ہوتی ہے وہ اپنے مدِ مقابل کو اُس کی روح تک زخمی کر جاتی ہے۔ خنجر اور گولی کا زخم تو بدن پر لگتا ہے وہ ٹھیک بھی جلد ہو جاتا ہے مگر زبان ایک ایسا ہتھیار ہے کہ جس سے ادا کیا ہوا لفظ تکلیف دہ اور نا قابل علاج ہوتا ہے اور اگر اِسی زبان سے نرم لہجے میں بات کی جائے، پیار سے گفتگو کی جائے تو یہی زبان مرہم کا کام دیتی ہے زخموں پر نمک چھڑکنے کی بجائے دوائی کے طور پر استعمال کی جا سکتی ہے۔

یہی آج بات کرنی ہے کہ ہم سب کو اپنے اپنے مدار میں رہتے ہوئے اپنی اپنی زبانوں پر قابو رکھنا چاہیے کیونکہ جو ہمارے معاشرے کا ماحول چل رہا ہے جس کے اندر ہر طبقہ فکر کا انسان اپنی اپنی بولی بول رہا ہے ایک دوسرے کو زبان کی مار دینے کی کوشش کر رہا ہے تاکہ دوسرے کے عیبوں کی نمائش کی جائے دوسرے کی خامیوں کو نمایاں کر کے پیش کیا جائے۔ یہ انتہائی غیر اخلاقی اور غیر مہذب سوچ ہے، میں کسی خاص طبقے کی نشاندہی نہیں کر رہا بلکہ ہمارا آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے خاص طور پر زبان کے حوالے سے بیان کے حوالے سے عام آدمی سے لے کر ہر شعبے سے تعلق رکھنے والا انسان اس کام میں ملوث ہے۔ میرے ہاتھ میں قلم ہے یہی کوشش ہے کہ میری زبان اور میرے قلم سے کسی کا دل نہ دُکھے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ پنجابی کی [illegible]ت ہے جو اکثر میری ماں

کہا کرتی تھی زبان کے حوالے سے "تو منومنہ چوکڈ میں تنوں شہروں کڈنی آں" یعنی تو مجھے زبان سے نکال میں تجھے شہر سے نکال دوں گی۔

یہی وہ حالات وواقعات ہیں اگر ہم زبان کے حوالے سے سوشل میڈیا پر دیکھیں تو بڑے بڑے لوگ جو دانشور ہیں اہل عقل ہیں فہم وفراست رکھتے ہیں اُن کی زبانوں سے ایسے ایسے الفاظ نکلتے ہیں کہ انسان دنگ رہ جاتا ہے کہ ہم کس طرف جا رہے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کتنے ہی خوبصورت انداز میں ہمارے دین ودنیا دونوں کو بچانے کا بہترین فارمولا دے دیا ہے شاید اس سے بڑا فارمولا آج تک روزمرہ کی زندگی میں کسی بڑے سے بڑے دانشور نے نہیں دیا ہوگا۔ آپؐ عالم انسانیت کیلئے رحمت بن کر آئے آپ کا ایک ایک عمل جو آپؐ نے اپنے ہاتھوں سے کیا، یا اپنی زبان سے جو کلمات ادا کئے وہ ہم سب کیلئے دنیا اور آخرت میں نجات کا باعث بنیں گے۔ اگر ہم نے سچے دل سے اپنی زبانوں پر قابو پالیا اور اپنے معاشرے کو درگزر اور برداشت کرنے کا سلیقہ سکھا دیا تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہم اہل پاکستان دنیا کی عظیم قوموں میں شامل ہو جائیں گے اسی لئے آپ سب سے دلی درخواست ہے کہ ایک دوسرے پر کیچڑ مت اُچھالیں اپنی زبانوں کا استعمال سوچ سمجھ کر کریں بھلے وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ ہو رشتہ داروں کے ساتھ ہوں، دوست احباب کے ساتھ ہوں، اپنے ملازمین کے ساتھ ہوں، اپنے افسران بالا کے ساتھ ہوں اپنے قومی ہیروز کے ساتھ ہوں، اپنے ملکی اداروں کے حوالے سے ہوں۔ ہمیں ہر حال ہر صورت میں اپنی زبان پر قابو رکھنا ہے کیونکہ زبان سے نکلے الفاظ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ بندوق کی گولی سے زیادہ تکلیف دہ اور نقصان دہ ہوتے ہیں۔ اللہ ہمیں زندگی گزارنے کا طریقہ سلیقہ عطا فرمائے۔ آمین

میرا ہاتھ تھام
میرے ساتھ چل
میں بھٹک گیا ہوں
گناہوں میں
مجھے دے صدا
میری بات سن
درِ ذات کھول
مجھے دے پناہ

میں فقیر ہوں
تری ذات کا
مرے دل کے
کاسے میں ڈال دے
تو زکوٰۃ اپنے وجود کی
یہ یقین میرا ایمان ہے
یہی حق ہے یہی گمان ہے

امین کنجاہی

مکتبہ پاک ادب